ڈاکٹر محمد یونس بٹ
مزاح پرسی

مزاح پرسی

بابائے لطیفہ

عنوان سے آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم نواب زادہ نصر اللہ خان کے بارے میں لکھنا چاہ رہے ہیں۔ اگرچہ ان پر لکھ کر ہمیں اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی ایک اچھا لطیفہ پڑھ کر۔ ایک بار ایک کتاب کے ٹائٹل پر صرف نواب زادہ کی تصویر دیکھ کر ہم نے اسے لطیفوں کی کتاب سمجھ کر خرید لیا اور بعد میں وہ سیاسی کتاب نکلی۔ ویسے بھی آج کل جتنے مشہور لطیفے ہیں۔ وہ سب سیاست میں ہی ہیں۔ سیاست ویسے بھی فنون "لطیفہ" میں شامل ہے۔ اس کے باوجود ہمارا یہ

کالم بابائے لطیفہ ملا نصرالدین کے بارے میں ہے۔یاد رہے یہاں ملا نصرالدین سے مراد پیر پگاڑا نہیں ہے۔ دراصل ہوا یہ ہے کہ ایک افغان مصنف ادریس شاہ نے اپنی کتاب "The Sufi's" میں ملا نصرالدین کو بہت بڑا صوفی قرار دیا ہے۔ ہمیں یہ تو نہیں پتہ کہ ملا نصرالدین کتنا پہنچا ہوا صوفی ہے۔ یہ پتہ ہے کہ وہ ہم تک ابھی پہنچا ہے۔ ادریس شاہ نے تو اس کا نام فرید الدین عطار' مولانا روم اور شمس تبریز جیسے صوفیوں کی فہرست میں درج کیا ہے۔ بات فہرست تک رہتی تو بڑی بات نہ تھی کہ ہم نے تو غالب' میر' اقبال اور فیض جیسے شاعروں کی فہرست میں ظفر اقبال کا نام لکھا پڑھا ہے۔ لیکن ادریس شاہ نے لطیفوں سے انہیں ایسے ہی صوفی ثابت کیا ہے جیسے ہم نواب زادہ نصراللہ خان کو بابائے جمہوریت ثابت کرتے ہیں۔ اس سے اور کچھ ہو نہ ہو' ہمیں ملا کے لطیفوں پر ہنسی آنا بند ہو گئی ہے۔ اب ہمیں وہ صوفیانہ کلام لگنے لگے ہیں۔

دنیا میں غم اتنے ہوگئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں سب سے بڑا موجد وہ ہے جس نے ہنسنا ایجاد کیا۔ پال جانسن کی تحقیق کے مطابق دنیا کے ریکارڈ پر جو پہلی ہنسی ہے۔ وہ دو ہزار سال قبل مسیح کی ہے جو حضرت سارہ کے چہرے پر آئی۔ جب ان کے خاوند حضرت ابراہیم کو خدا نے بڑھاپے میں باپ بننے کی بشارت دی تھی۔ ماہر لسانیات کہتے ہیں حضرت یعقوب کے والد اسحٰق جب پیدا ہوئے تو وہ ہنس رہے تھے۔ اس لیے ان کے نام کا مطلب "قہقہہ" ہے۔ دنیا کا پہلا لطیفہ کب پیدا ہوا۔ ہم وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ہماری سکھوں کے بارے میں معلومات بڑی واجبی سی ہیں۔ ایک فوٹوگرافر نے کئی قوموں کے لوگوں کی تصویریں بنانے کے بعد کہا تھا میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں اتنے لطیفے انسان نے نہیں بنائے جتنے خدا نے بنائے ہیں۔ ہم ظریف الاعتقاد نہیں اس کے باوجود سمجھتے ہیں لطیفے' ٹیکسی ڈرائیور اور خاوند ہر ملک میں ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ وہ لطیفے جو مہنگے بکتے ہیں انہیں "چیپ" لطیفے کہتے ہیں۔ امجد اسلام امجد کو ملنے کے بعد بندہ سمجھنے لگتا ہے' دنیا کی سب سے پرانی چیز جو آج تک نہیں بدلی' وہ لطیفے ہیں۔ ہمارے ہاں مزاح نگار اسے کہتے ہیں جو پرانے لطیفے تخلیق کرتا ہے۔ دنیا کا سب سے پاپولر لطیفہ کون سا ہے؟ یہ جاننا ایسے ہی ہے جیسے لندن میگزین نے یہ جاننے کے لیے کہ عورتوں کی محبوب پینٹنگ کون سی ہے' ایک مقابلے کا اہتمام کیا۔ جس میں باری باری پوچھا گیا کہ اگر Tate Gallery کو آگ لگ جائے اور آپ کو صرف ایک پینٹنگ بچانے کی

اجازت ہو تو آپ کونسی بچائیں گی؟ تو جس خاتون کو پہلا انعام ملا' اس کا جواب تھا۔ "جو دروازے سے قریب ترین ہوگی۔" لیکن اگر دنیا کے سب سے محبوب لطیفہ نگار کا نام پوچھا جائے تو وہ نصرالدین ہی ہوگا۔ کسی ملک میں وہ آغا کہلاتا ہے' کہیں ملا اور کہیں خواجہ نصرالدین۔ ازبکستان کے قومی ہیرو امیر تیمور کا سوانح نگار جیمز لیمب اس کی خوبیاں بتاتے ہوئے لکھتا ہے۔ امیر تیمور ساری زندگی کبھی کسی لطیفے پر نہیں ہنسا۔ اس کے سامنے کوئی لطیفے پر ہنستا تو وہ یوں غصے میں آجاتا جیسے دوسرا اس پر ہنسا ہو۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ لطیفے پر ہنسنے کے لیے دانت ہی نہیں' دونوں ٹانگیں بھی ٹھیک ہونی چاہئیں۔ لیکن آج بھی اس کے ملک کے لوگ امیر تیمور سے زیادہ نصرالدین آفندی کی باتیں کرتے ہیں۔ ملا نصرالدین میں اتنی ہی حماقت پائی جاتی ہے' جتنی ہم میں دانش۔ اس نے دنیا کا ہر پیشہ اختیار کیا' سوائے دنیا کے سب سے پہلے پیشے کے۔ ملا میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کسی ملا میں نہیں ہونا چاہئیں۔ اقلیم ظرافت کا یہ مستقل نگران وزیراعظم 1208ء میں ایکشر میں پیدا ہوا۔ ترکی کا باشندہ ہونے کی وجہ سے وہ ہر بات کا جواب ترکی بہ ترکی دیتا۔ ملا پیدائشی ملا تھے۔ مذہبی تعلیم کے لیے کونیا کے مشہور مدرسے میں داخل کر دیئے گئے۔ بچپن ہی سے طبیعت مزاح کی جانب راغب تھی۔ مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر مدرس بنے' پھر قاضی بن گئے۔ کچھ عرصہ شاہان اناطولیا کے دربار سے وابستہ رہے لیکن اپنی ظرافت سے اپنی زندگی ناقابل برداشت حد تک تلخ بنالی۔ سو اناطولیا کے دربار کو چھوڑ کر کونیا کے سلجوقی سلطان کے پاس چلے گئے اور ایک عالم فاضل کے طور پر پہچانے جانے لگے۔ ہم بھی انہیں عقل و دانش کا مجسمہ مانتے ہیں۔ ہمیں ان کا گدھا بھی اتنا گدھا نہیں لگتا جتنے گدھے عام گدھے ہوتے ہیں۔ ملا کی بیوی دیکھنے میں ایسی تھی کہ شام مکتب سے آکر ملا نے بیوی کے چہرے کو انہماک سے دیکھنا شروع کر دیا۔ بیوی نے وجہ پوچھی تو ملا بولے: "آج میں نے ایک بہت خوبصورت عورت کو دیکھا۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنی آنکھوں کو ادھر سے ہٹاؤں مگر کامیابی نہ ہوئی۔ لہٰذا کم از کم سو دفعہ تمہارے چہرے کو دیکھوں گا تاکہ اس کا کفارہ ادا کر سکوں۔"

ادریس شاہ کی طرح ملا کے زمانے کے لوگ بھی ملا کو صوفی سمجھ لیا کرتے تھے۔ ملا ایک بار ایک گاؤں سے گزر رہے تھے۔ حسب عادت بھوکے تھے۔ گاؤں کے لوگ ایک جگہ بیٹھے

تھے۔ ملا نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: "جلدی سے میرے لیے کھانے کا بندوست کرو۔ ورنہ آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں گا جو دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا ہے۔" ملا کا اعلان سن کر لوگ ڈر کے مارے اسے صوفی سمجھ کر کھانے پینے کی اشیاء کا انتظام کرنے لگے۔ جب ملا پیٹ بھر کر طرح طرح کے کھانے کھا چکے تو گاؤں والوں نے پوچھا: "یا حضرت! آپ نے دوسرے گاؤں والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟" ملا نے جواب دیا: "میں ان کے گاؤں گیا۔ کھانا مانگا۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ میں ان کا گاؤں چھوڑ کر فوراً آپ کے گاؤں آ گیا۔ اگر آپ لوگ بھی مجھے کھانا نہ دیتے تو میں آپ کا گاؤں چھوڑ کر کسی دوسرے گاؤں چلا جاتا۔" ایک بار اس کے علاقے کے لوگوں نے کہا کہ دعا کریں اللہ ہم گناہ گاروں پر رحمت باراں بھیجے۔ ملا راضی ہو گئے اور دعا استسقاء کے لیے مقررہ میدان میں گئے۔ سینکڑوں آدمی جمع تھے۔ ملا نے ان کا جائزہ لیا اور بولے: "لوگو یقین کے ساتھ امید یہ دونوں اصل ایمان ہیں۔ آپ لوگ بارش کی دعا کروانے آئے ہیں اور آپ میں سے ایک بھی ساتھ چھتری نہیں لے کر آیا۔ اس کا مطلب ہے آپ کو دعا کے قبول ہونے کی توقع ہی نہیں۔ اس لیے میں ایسے لوگوں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے تیار نہیں۔" بہر حال اس سے یہ پتہ چلے نہ چلے کہ ملا نصر الدین صوفی تھے یا نہیں، یہ ضرور پتا چلتا ہے وہ سیاست دان ضرور تھے۔ ادریس شاہ کی کتاب پڑھ کر آپ ملا نصر الدین کو صوفی مانیں یا نہ مانیں۔ یہ مانیں گے کہ مصنف میں سینس آف ہیومر ہے۔

ماہرِ امراض طوطا چشم

ماہر امراض چشم بھی عجیب آدمی ہوتا ہے کہ لوگ اسے آنکھیں بھی دکھائیں تو خوش ہوتا ہے۔ ہمارا ایک دوست دل کا ڈاکٹر بننے کی بجائے آنکھوں کا ڈاکٹر اس لیے بنا کہ دل تو ایک ہوتا ہے اور آنکھیں دو۔ سو دوگنے مریض آئیں گے۔ آنکھیں اپنی باتوں کا اور کان دوسروں کی باتوں کا یقین کرتے ہیں۔ آنکھیں اتنی بڑی نعمت ہیں کہ کہتے ہیں بہرا بہشتی اور اندھا دوزخی۔ آج کل سپیشلائزیشن کا دور ہے۔ سو ممکن ہے چند سال بعد دائیں اور بائیں آنکھ

کے الگ الگ ماہر ہوں' لیکن ہمیں ڈنگر ڈاکٹروں سے ہمیشہ سے شکایت تھی کہ ان کے ہاں سپیشلسٹ نہیں ہوتے۔ بالخصوص امراض ماہر طوطا چشم تو ایک بھی نہیں ہے لیکن محترمہ نور جہاں صاحبہ کا یہ بیان پڑھ کر کہ موسیقار طوطا چشم ہیں' ہماری یہ شکایت جاتی رہی۔ ہمیں موسیقی سے تب سے لگاؤ ہے جس دن سے ہم نے میڈم نور جہاں کو دیکھا ہے یعنی مدتیں ہو گئیں۔ ہمیں علم نجوم کا شوق ہوا تو ستاروں کی چال دیکھنے فلم سٹوڈیوز جانے لگے۔ انہی دنوں ایک گلوکارہ نے ایک موسیقار سے کہا: "مجھے نور جہاں کے مقام تک پہنچا دیں۔" تو موسیقار بولا: "میں تو نہیں پہنچا سکتا۔ البتہ چونتیس نمبر ویگن ادھر کو جاتی ہے۔" ہم میڈم کی گلوکاری کے ہی فین تھے۔ پتہ نہیں تھا کہ وہ امراض طوطا چشم کی ماہر بھی ہیں۔ ان کے بیان کے بعد سے وہ موسیقار جو آنکھوں سے صرف چشم پوشی کا کام لیتے تھے' ملنے والوں کو بھی آنکھیں دکھانے لگے ہیں۔ ہم نے میڈم کی آنکھیں نہ دیکھیں۔ کہتے ہیں وہ صرف اپنوں کو آنکھیں دیکھاتی ہیں۔ میڈم آنکھیں دکھا سکتی ہیں۔ وہ اداکارہ ریشم کی طرح تو نہیں جسے خود اپنی آنکھیں دیکھنے کے لیے ڈھونڈنا پڑتی ہیں۔ ہمیں حیرانی یہ ہوئی ہے کہ موسیقاروں کو طوطا چشم کہنے پر رشید عطرے' ایم اشرف' ذوالفقار علی اور دوسرے کئی موسیقار جن کا طوطی بول رہا ہے' بولنے لگے ہیں۔ ویسے ہمیں آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ آخر طوطے کی آنکھوں میں کیا خرابی ہے کہ انسان کو طوطا چشم کہا جاتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ طوطے کی بجائے اس پر برا بھی انسان ہی مناتا ہے۔ ہماری اردو شاعری میں محبوب کی تعریف کرنے کے لیے اس کی آنکھوں کو ہمیشہ جانور سے تشبیہ دی جاتی ہے جیسے ہرنی جیسی' مچھلی جیسی یا بلی جیسی آنکھیں آخر ہم طوطا پسند شخص ہیں۔ ہمیں طوطے میں اس کے علاوہ کوئی خرابی نظر نہیں آتی کہ وہ انسانوں کی طرح باتیں کرنا سیکھ جاتا ہے۔ کہتے ہیں طوطے کی آنکھوں کو برا اس لیے کہتے ہیں کہ دوسرے پرندوں مثلاً کبوتر وغیرہ کو سدھاؤ اور اسے پنجرے سے نکال بھی دو تو خود ہی پنجرے میں واپس آجائے گا' جبکہ طوطے کو جتنی مرضی چوری کھلاؤ۔ برسوں بعد بھی آپ کی غلطی سے پنجرے کا دروازہ کھلا رہ گیا تو وہ پھر سے اڑ جائے گا' کیونکہ طوطا کسی سے مخلص نہیں ہوتا سوائے طوطیوں کے۔ ہمیں اس کی یہی خوبی سب سے اچھی لگتی ہے۔ کبوتر امن' گدھا نحوست' شاہین بہادری اور کوئل خوش الحانی کی علامت ہے تو طوطا آزادی کی علامت ہے۔

وہ اپنی آزادی کے لیے کوئی کمپرومائز نہیں کرتا۔ کہتے ہیں انسان آزاد پیدا ہوتا ہے حالانکہ ہم نے جتنے بھی انسان پیدا ہوتے دیکھے' کوئی بھی فری نہ تھا۔ سب Cord کے ذریعے ماں سے بندھے ہوئے تھے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمام انسان فری پیدا ہوتے ہیں' سوائے ان کے جو پرائیویٹ میٹرنٹی ہسپتالوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ جب کہ طوطا آزاد پیدا ہی نہیں ہوتا' آزاد رہتا بھی ہے۔ جیسے نیو آکسفورڈ ڈکشنری میں کچھ ایسی ترکیبیں ہیں جن کے وہ معنی نہیں لیے جاتے ہیں۔ جیسے تاریخ کے لیے History کا لفظ ہے۔ حالانکہ تاریخ میں خواتین کا حصہ کم تو نہیں۔ سو اسے Herstory کیوں نہیں کہا جاتا۔ ایسے ہی اردو ڈکشنری میں طوطا چشم سے جو مراد لیا جاتا ہے۔ اس سے مراد پوری نہیں ہوتی۔

گفتگو کے معاملے میں میڈم نور جہاں عورتوں کی شیخ رشید ہیں۔ ہمارا منہ جتنا سرخ ان کی باتوں سے ہو جاتا ہے' اتنا تھپڑ سے نہیں ہوتا۔ نئی گلوکاروں کے آنے سے میڈم آج کل صرف باتیں ہی کر رہی ہیں۔ یونانیوں اور رومیوں کے دور میں عزت ماپنے کا پیمانہ یہ تھا کہ کس کو کتنی فرصت ہے؟ سو آج کل موسیقار میڈم کو زیادہ سے زیادہ عزت دینے میں لگے ہوئے ہیں۔ میڈم ذرا سی بات محسوس کر لیتی ہیں۔ کہتے ہیں ایک دفعہ جوانی میں کہنے لگیں: "کل میری بڑی بے عزتی ہوئی۔" پوچھا: "کیا ہوا؟" بولیں: "میں نے فلاں اداکار سے کہا مجھے میرے گھر تک چھوڑ آؤ۔ تو وہ سیدھا مجھے میرے گھر تک چھوڑ آیا۔" اب موسیقاروں نے نئی لڑکیوں کو گوانا شروع کیا ہے تو میڈم محسوس کر گئی ہیں۔ اس عمر میں بندہ یہی کچھ ہی محسوس کر سکتا ہے۔ جب صبح کی نشریات کو مستنصر حسین تارڑ سے فارغ کیا گیا تو اسلام آباد ٹیکسی ڈرائیور یونین کے عہدے دار ان کے پاس آئے اور کہنے لگے ہم ٹیکسیاں ٹی وی لے جائیں گے اور اس حد تک جائیں گے کہ ٹی وی والے آپ کو دوبارہ بلانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ وہ تو تارڑ صاحب نہ مانے ورنہ دو تین ٹیکسیاں ہی ٹی وی والوں کا فیصلہ بدلنے کے لیے کافی تھیں' لیکن میڈم پر ہونے والی زیادتی پر ٹیکسی ڈرائیور یونین نے بھی احتجاج نہیں کیا۔ حالانکہ ٹیکسی ڈرائیور نئی گلوکاروں کے گانے سن لیتے تو انہیں یقین ہو جاتا کہ سائیلنسر کتنی بڑی ایجاد ہے۔ اس کے باوجود میڈم پہلے دن کی طرح آج بھی اتنی ہی پسند کی جاتی ہیں' جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ نصاب میں

پڑھائی نہیں جاتیں۔ وہ ہمارے موسیقی کی جان ہیں اور آج کل موسیقی کی جان بنی ہوئی ہے۔ ریٹائرڈ چیف جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ صاحب کے والد محسن شاہ کا قد ان سے چند انچ ہی بڑا تھا۔ وہ نسیم حسن کے قد کے بارے میں بڑے فکر مند رہتے۔ ایک دن وہ انہیں حکیم قرشی کے پاس لے گئے۔ حکیم صاحب نے نسیم حسن کو ایک کونے سے دوسرے کونے کی طرف چلنے کو کہا۔ نسیم حسن شاہ بتاتے ہیں' میں نے چل کر دکھایا تو حکیم قرشی میرے والد کو کہنے لگے: "تمہارے بیٹے کا قد نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ حلال زادہ ہے۔" سو ہمارے موسیقاروں کا قد بھی نہیں بڑھ سکتا کیونکہ یہ اوریجنل ہیں۔ تاہم انہیں خوش ہونا چاہیے کہ میڈم نے انہیں بے وفا سمجھ کر طوطا چشم کہا۔ اگر وہ انہیں وفادار سمجھ کر تشبیہ دینا چاہتیں تو بڑا مسئلہ پیدا ہو جاتا۔ آپ کو پتہ ہی ہے وفا کی علامت کون سا جانور ہے۔

بیگم ڈول اور بیگم ڈانواں ڈول

ہم نے ایک امریکی صحافی سے ان کے سابقہ حکمرانوں کی تصاویر مانگیں تو اس نے ہمیں جو صویریں بھجوائیں' وہ خواتین کی تھیں۔ ہم نے کہا: "جہاں تک ہمیں علم ہے۔ امریکہ میں آج ک کوئی خاتون صدر نہیں بنی۔" بولے: "وائٹ ہاؤس کی اصل حکمران تو صدور کی بیویاں ہوتی یں۔" شاید اسی لیے اس بار امریکی گدھے اور ہاتھی کی بجائے بل کلنٹن اور باب ڈول کی بیویوں ں مقابلہ کر رہے ہیں۔ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ جس طرح صدارت کے امیدواروں کا آپس میں

مباحثہ ہوتا ہے ایسے ہی ان کی بیویوں کا بھی ہونا چاہیے تاکہ بیوی دیکھ کر صدر بنایا جائے۔ ہم نے ایک مبصر سے پوچھا: "امریکی سیاست میں آنے کے لیے سب سے پہلے کیا ضروری ہے؟" بولے: "بیوی۔ کیونکہ آج تک صرف ایک امریکی صدر کنوارہ ہوا ہے۔" اب تو شاید امریکی شادی کرتے ہی اسی امید پر ہیں۔ صدور کی بیویوں میں سب سے بڑی خوبی یہی ہوتی ہے کہ ان کے خاوند صدر ہوتے ہیں۔ ونسٹن چرچل سے کسی نے پوچھا: "آپ کی بیوی نے کس موقع پر آپ سے زیادہ عقل مندی کا مظاہرہ کیا؟" تو وہ بولے: "اس وقت جب اسے اپنے لیے خاوند کا انتخاب کرنا تھا۔" سیانے تو نبض دیکھ کر مرض اور بیوی دیکھ کر خاوند کی حالت بتا دیتے ہیں۔ آج کل امریکی صدر دنیا کا سب سے طاقت ور آدمی ہے۔ اس کا سب پر حکم چلتا ہے۔ اور اس پر اگر کوئی حکم چلا سکتا ہے تو وہ اس کی بیوی ہی ہے۔ اس لیے صدر جانسن نے اپنی بیوی لیڈی برڈ سے ڈر کر اوول آفس میں بزر سسٹم لگوا لیا تھا تاکہ جونہی بیوی آئے تو صدر کو بروقت خبردار کیا جاسکے۔

امریکیوں کو اپنے صدور سے زیادہ ان کی بیویوں پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ صدور پر کوئی چیک نہیں ہوتا سوائے بیویوں کے۔ جو بیوی سے نہیں ڈرتا وہ کنوارہ ہی ہو سکتا ہے۔ انگلینڈ کے ڈیوک آف مارلبورگ نے بیوی کو ایک جنگ کے دوران لکھا تھا: "میرے سامنے اس لمحے دنیا کے ساٹھ ہزار بہترین فوجی ہیں جن کی کمان یورپ کے بہترین جرنیل کر رہے ہیں، لیکن مجھے ان سے اس سے آدھا خوف بھی نہیں جتنا تمہیں غصے میں دیکھ کر ہوتا ہے۔" مارتھا واشنگٹن تو امریکہ کے صدر کو "مائی اولڈ مین" کہہ کر بلاتی۔ اینڈریو جانسن نے اپنی زندگی درزی کی حیثیت سے شروع کی۔ اس کی بیوی نے اسے پڑھا لکھا کر امریکہ کا صدر بنایا۔ بولی: "جب جانسن صدر بن گیا تو میں وائٹ ہاؤس میں بیوی کے عہدے پر فائز ہو گئی۔" صدر ولسن کی بیوی آئیڈیل بیوی ثابت ہوئی۔ شروع ہی سے اسے جانور پالنے کا شوق تھا۔ جب ولسن جنگ عظیم اول میں مصروف تھا تو اس کی بیوی نے وائٹ ہاؤس میں بھیڑیں پال رکھی تھیں تاکہ موزے بننے کے لیے "تازہ اون" دستیاب ہو۔ ٹرومین جب کوئی غلط بات کرتا اس کی بیوی اسے ٹوک دیتی۔ اس لیے وہ غلط بات کرنے سے پہلے بیوی کو ادھر ادھر بھیج دیتا۔ باربرا خاوند سے ناراض ہوتی تو اسے اپنے ہاتھ سے کھانا پکا کر کھلاتی۔ جب صدر بش نے اس سے پوچھا کہ میں نے خلیج کی جنگ کا فیصلہ ٹھیک کیا ہے یا غلط؟ تو وہ بولی: "میرے لیے ایک کپ کافی بنا کر لاؤ۔" پچھلے دنوں بل کلنٹن کی پچاسویں سالگرہ پر ایک

خاتون نے بل سے پوچھا: "پچاس سالوں میں آپ کی سب سے بڑی کامیابی کون سی رہی؟" تو کلنٹن نے کہا: "1975ء میں ہیلری کو اپنے ساتھ شادی کے لیے رضامند کرنا۔" کلنٹن کی زندگی پر ہیلری نے جو نقوش چھوڑے، ان میں ایک نشان کلنٹن کی ناک پر تھا، جس کی پلاسٹک سرجری کرالی گئی کیونکہ آج کل حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں نہیں، پلاسٹک سرجن کے نشتر میں ہوتا ہے۔ کلنٹن پر کئی مقدمے ہیں۔ اب وہ 1.7 ملین ڈالر کا مقروض ہے۔ اگرچہ عورت کا خاوند مرد اور مرد کا خاوند قرضہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں ایک عدالت میں ایک وکیل نے کلنٹن سے پوچھا: "کیا پہلے آپ پر جرح ہوئی؟" تو دوسرا وکیل بولا: "ہاں یہ شادی شدہ ہے۔"

ایک اوسط امریکی بیوی اس سے آدھا سنتی ہے جتنا اس کا خاوند بولتا ہے۔ وہاں جو جوڑے خوش رہ رہے ہوتے ہیں، وہ ہر ہفتے تقریباً 57 منٹ آپس میں بات کرتے ہیں اور جن کی طلاق ہونے والی ہوتی ہے، وہ ہفتے میں 117 منٹ باتیں کرنے لگتے ہیں۔ ایک امریکی ادیب لکھتا ہے: "میں اور میری بیوی نے پندرہ سال بڑی ہنسی خوشی گزارے، پھر ہم نے شادی کر لی۔" امریکہ میں صرف 38 فیصد گھروں میں بیویاں ہیں۔ ایک امریکی بیوی کو اوسطاً سال میں 47 سر درد ہوتے ہیں اور وہ 1500 مرتبہ آئینہ دیکھتی ہے۔ امریکی شادی شدوں کو ہی اپنا صدر شاید اس لیے چنتے ہیں کہ ان میں قوت برداشت زیادہ ہوتی ہے۔ یہی جاننے کے لیے کہ ان کے آئندہ صدر میں کتنی قوت برداشت ہوگی، وہ ان کی بیویوں کا مباحثہ چاہتے ہیں۔ امریکی شکل پر اتنا جاتے ہیں کہ 1959ء کے مشہور ٹی وی مباحثے میں نکسن اور کینیڈی کو چن لیا۔ جہاں تک بیگم ڈول اور بیگم کلنٹن کا تعلق ہے۔ بیگم ڈول پاس نہ ہو تو ہیلری اچھی لگتی ہے۔ وہ پاس ہو تو ہیلری بہت اچھی لگتی ہے۔ باب ڈول اتنا اچھا ڈیبیٹر ہے کہ وہ تو بحث میں اپنی بیوی سے بھی جیت جاتا ہے۔ ہیلری کو یہ فائدہ ہے کہ امریکی اس کے بارے میں بہت زیادہ جانتے ہیں۔ جب کہ بیگم ڈول کو یہ فائدہ ہے کہ امریکی اس کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ دونوں بیگمات کا آئی کیو ٹیسٹ ہونا چاہیے۔ یاد رہے آئی کیو وہ چیز ہے جو مرد عورت میں دیکھنا چاہتا ہے اس وقت جب وہ اور سب دیکھ چکا ہوتا ہے۔ 57 فیصد امریکی سمجھتے ہیں ہیلری بل کلنٹن کی بہترین سرمایہ کاری اور بدترین ذمہ داری ہے، جب کہ بیگم ڈول کا معاملہ ڈانواں ڈول ہے۔ جہاں تک مباحثے کا تعلق ہے، اس کا موضوع شاپنگ ہونا چاہیے کیونکہ شاپنگ کرتے ہوئے خواتین اول درجے کی صلاحیتیں سامنے

آتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو مرداول کی صلاحیتیں بھی تب ہی سامنے آتی ہیں۔ اگرچہ مردوں کی شاپنگ پر یہ تبصرہ ہی کافی ہے کہ ہر بڑے ڈیپارٹمنٹل سٹور پر مردوں کی ضروریات کی چیزیں ہمیشہ گراؤنڈ فلور اور گیٹ کے پاس رکھی جاتی ہیں۔ کچھ امریکی عورتوں کے مباحثے کے حق میں نہیں کہ اس میں وہ بہت بولیں گی، حالانکہ امریکی ماہر فلکیات مائیکل کولنز کہتا ہے: "ایک مرد دن بھر میں اوسط پچیس ہزار الفاظ بولتا ہے جب کہ ایک عورت کی دن بھر کی گفتگو تیس ہزار الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے۔" مسئلہ صرف یہ ہے کہ مرد جب دن کے اختتام پر گھر پہنچتا ہے تو وہ اپنے پچیس ہزار الفاظ بول چکا ہوتا ہے، جب کہ بیوی تیس ہزار الفاظ کا آغاز کر رہی ہوتی ہے۔" ان دونوں بیگمات میں وہی فرق ہے جو ان کے خاوندوں میں ہے۔ امریکی جریدے تو کلنٹن اور ڈول کے ڈولے، قد، وزن اور کمر کے ماپ کے یوں تقابلی جائزے شائع کر رہی ہیں جیسے انہیں فلم کے لیے ہیرو کی تلاش ہو۔ اب دیکھتے ہیں دونوں بیگمات میں سے کسے مات ہوتی ہے اور کسے امریکی گڈ گرل قرار دیتے ہیں۔ ویسے امریکیوں کا کچھ پتہ نہیں۔ ایک لڑکی نے کہا:

"میں ایک گڈ گرل ہوں۔"

امریکی بولا: "پھر تم واقعی گڈ گرل ہو۔"

بولی: "کسی نے بھی نہیں۔"

بیوٹی سنڈروم

اس صدی کے شروع میں جب ایک سیانے نے کہا کہ بیوی کی تلاش میں نکلو تو آنکھ کی بجائے کان کا استعمال کرو کیونکہ آپ نے بیوی کو اتنا دیکھنا نہیں، جتنا سننا ہوتا ہے تو کسی نے اس دانشور کی بات پر کان نہ دھرے۔ اب ڈاکٹر ایڈگر نے کہا ہے کہ خوبصورت بیوی صحت کے لیے مضر ہے تو سب کے کان کھڑے ہوگئے ہیں۔ ڈاکٹروں کی باتیں سن سن کر ہم بھی خود کو ڈارون، مارکس، ٹالسٹائی اور فرائڈ سمجھنے لگے ہیں۔ یعنی ہمیں بھی مستقل سردرد رہنے

لگا ہے۔ ہم ڈاکٹروں کے دلدادہ نہیں‘ کیونکہ مقدمہ بازی کے شوقین کے پاس دولت اور ڈاکٹروں کے دلدادہ کے پاس صحت کم ہی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود ہم ڈاکٹروں کو مانتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ بندہ ایک گردے سے بھی زندہ رہ سکتا ہے۔ ہم نے مرنے کے بعد ایک گردہ عطیے میں دینے کا اعلان کر دیا ہے۔ ہم تو شادی کے چھ سات سال بعد کسی میاں بیوی کو ایک ساتھ واک کرتے دیکھ لیں تو ہمیں یقین ہو جاتا ہے کہ میاں کو یہ کچھ کرنے کا ڈاکٹر نے کہا ہوگا۔ امریکیوں کو تحقیق کرنے کا اس قدر شوق ہے کہ انہیں کوئی موضوع نہ ملے تو اس پر تحقیق کرنے لگتے ہیں کہ ان کے "فور فادرز" کون تھے۔ کچھ تحقیق محدود رکھتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کا "سنگل فادر" کون تھا؟ گزشتہ دنوں وہاں کی ایک یونیورسٹی نے 3519 مرے ہوئے‘ شادی شدہ مردوں کی میڈیکل ہسٹری پر ریسرچ کرنے کے بعد یہ انکشاف کیا کہ خوبصورت بیویوں کے خاوند جلد مر جاتے ہیں۔ ڈاکٹر ایڈگر نے کہا کہ بدصورت اور قبول صورت بیویوں کے خاوندوں کی اوسط عمر خوبصورت بیویوں کے خاوندوں سے 12 سال زیادہ ہوتی ہے۔ ہم نے سوچا شاید بدصورت بیویوں کے خاوندوں کو ویسے ہی اپنی عمر 12 سال زیادہ لگتی ہو‘ لیکن ڈاکٹر ایڈگر نے بتایا کہ حسین بیوی کے خاوند 80 فیصد زیادہ تناؤ کا شکار رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی منواتی ہیں‘ پھر امریکی خاوندوں کو یہ ڈر رہتا ہے کہ ان کی حسین بیوی کہیں انہیں چھوڑ نہ جائے۔ وہ کسی تقریب یا بازار میں بیوی کے ساتھ چلے جائیں تو سب کی نظریں ان کی بیوی پر ہی ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ کبھی ریلیکس نہیں ہوتے۔ اگرچہ پاکستان میں اتنی پریشانی نہیں کیونکہ ہمارے ہاں عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ برقع میں ان کی صورت کم سیرت زیادہ دکھتی ہے۔ صوبہ سرحد کے بیشتر علاقوں میں تو سڑک پر عورت کا چہرہ نظر آنا ایسے ہے‘ جیسے سڑک پر سو کا نوٹ پڑا نظر آنا۔ ویسے تو ڈاکٹر ایڈگر کی اس ریسرچ سے ان کی ذاتی بیوی بھی پریشان ہے‘ کیونکہ ڈاکٹر ایڈگر کی طویل عمری کے باعث بیوی یہ سوچنے لگی ہے کہ اس کا مطلب ہے ایڈگر مجھے حسین ہی نہیں سمجھتا۔ ہماری ایک ممتاز اداکارہ کی بیٹی نے ماں سے کہا: "امی جب میں بڑی ہوں گی تو میرا بوائے فرینڈ بڑا ہینڈسم ہوگا۔" ماں نے مذاق میں کہا: "اگر تمہارا بوائے فرینڈ اتنا ہینڈسم ہوا تو دوسری لڑکیاں تم سے چھین لیں گی۔" وہ کچھ لمحے چپ رہی پھر اپنے باپ کی طرف دیکھ کر

بولی "آپ نے اسی لیے پاپا سے شادی کی تھی۔" گویا جن بیویوں کے خاوند خوبصورت نہیں ہوتے‘ وہ بھی سکھی رہتی ہیں۔ ویسے تو ہمیں یہ حسن شکن تحقیق بدصورتوں کی پبلسٹی کمپین لگتی ہے۔ اب تو کسی کو درازئ عمر کی دعا دینا بھی دراصل یہ دعا دینا ہے کہ اللہ اسے بدصورت بیوی دے۔ اگرچہ ڈاکٹر وہ بندہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کو بھی اس دن غور سے دیکھتا ہے جس روز وہ بیمار ہو۔ وہ تو خوبصورت عورت کو بھی دیکھنے کی فیس لیتا ہے‘ لیکن دنیا کے پہلے ہارٹ سرجن ڈاکٹر کرسٹن برنارڈ نے کہا ہے شکل اتنی اہم ہوتی ہے کہ اگر میں خوبصورت نہ ہوتا اور میری جگہ کوئی گنجا‘ ٹھگنا‘ بدشکل ڈاکٹر یہ آپریشن کرتا تو اسے وہ پذیرائی نہ ملتی جو مجھے ملی۔ ڈاکٹر کرسٹن نے ایک عورت سے شادی کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کسی نے وجہ پوچھی تو کرسٹن نے کہا: "اس کا ماضی!" سننے والے نے کہا: "خاتون بڑی صالح ہے۔ اس کا ماضی تو بہت اچھا ہے۔" تو ڈاکٹر کرسٹن بولے: "اچھا تو ہے مگر ہے بڑا لمبا۔" بہرحال حسین بیویوں کے خاوند عمر میں صرف 12 سال کا اضافہ کرنے کے لیے اپنی بیویاں چھوڑنے سے تو رہے‘ کیونکہ خوبصورت بیوی حاصل کرنا کون سا آسان کام ہے۔ ہم نے ٹی وی پر فلم "سرگم" دیکھی۔ عدنان سمیع کئی ولنوں اور ایکس کرشلز سے گزر کر اپنی زیبا بختیار تک پہنچتا ہے۔ ایلن کنگ کہتا ہے شادی شدہ آدمیوں کے لیے سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ غیر شادی شدہ لوگ اپنے پیسوں کا کیا کرتے ہیں؟ ایسے ہی خوبصورت بیویوں کے خاوندوں کے لیے سب سے پریشان کن بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ ان کی بیویوں کو خوبصورت کیوں کہتے ہیں؟ ہم نے ایک دوست سے پوچھا: "پرسوں فلاں ہوٹل میں تمہارے ساتھ وہ حسین دوشیزہ کون تھی؟" بولا: "وہ میری بیوی تھی‘ مگر خدا کے لیے یہ اس کے سامنے نہ کہہ دینا۔" ہم نے تو خوبصورت عورت کی شادی پر لوگوں کو خوش اور طلاق پر کبھی رنجیدہ ہوتے نہیں دیکھا۔ مشتاق یوسفی کہتے ہیں مجھے کافی اور کافکا‘ مرد کا ناچ‘ اتوار کے ملاقاتی اور خوبصورت عورت کے خاوند سے چڑ ہے۔ اٹلی کی کہاوت ہے: "جیسی بیٹی چاہتے ہو‘ ویسی بیوی لاؤ۔" سو کسی بھی بیوی سے بندہ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس کی مرضی ہے‘ ڈاکٹروں کو اس میں مداخلت نہیں کرنا چاہیے۔ ویسے سب سے اچھی شارک وہ ہوتی ہے جو مردہ ہو اور خوبصورت بیوی وہ ہوتی ہے جو دوسرے کی ہو۔ آپ کی گاڑی اس دن پرانی ہوتی ہے جس دن ہمسایہ نئی گاڑی

لاتا ہے۔ بیوی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

اردو شاعروں کو پڑھ کر لگتا ہے جتنے جان لیوا اسلحے ہیں' ان میں حسن سب سے کاری ہے۔ ان کا بس چلے تو بلا لائسنس حسن رکھنا قابل دست اندازی پولیس قرار دے دیں۔ حسن کا آنکھوں پر اتنا اثر پڑتا ہے کہ بیوی نے خاوند سے کہا: "دیکھا وہ سپاہی اس حسین لڑکی کو گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جو ابھی ابھی گزری ہے؟" تو خاوند بولا: "کون سپاہی؟" ہماری شاعری میں تو لوگ حسن پر ساری عمر قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اگر خاوند 12 سال قربان کر دیتے ہیں تو یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہم سمجھتے ہیں بیماری تو عمر ہے۔ بندے کو پیدا ہوتے ہی یہ مرض لگتی ہے اور بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ جرمن کہتے ہیں انسان تو پیدا ہوتے ہی مرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ لوگ جوانی میں مرتے ہیں اور اکثر حسینوں پر مرتے ہیں۔ البتہ یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ ان میں حسینوں کے اپنے خاوندوں کا نام آیا۔ ورنہ شاعری میں حسینوں کے خاوند اتنے ہی اہم تھے جتنے اہم وہ اپنے گھر میں ہوتے ہیں۔ جب یہ تحقیق بل کلنٹن کو اس کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر بتائی گئی کہ خوبصورت بیوی کے خاوند کی عمر بدصورت کے خاوند سے 12 سال کم ہوتی ہے تو ہیلری نے کلنٹن سے کہا: "تھینک گاڈ! تم نے مجھ سے شادی کی ورنہ تم آج 62 سال کے ہوتے۔"

مولانا زلزلہ

ہم صرف ان کے حق میں لکھتے ہیں جن کے ہم خلاف ہوتے ہیں کیونکہ ہم تو کسی کی تعریف بھی کر دیں تو لوگ اس پر ہنسنے لگتے ہیں۔ پھر ہم سیاستدانوں کے بارے میں اتنا کم جانتے ہیں کہ ان کے ساتھ ہمیشہ عزت سے پیش آتے ہیں۔ ایک سیاستدان نے کہا تھا کہ جب لوگ کہتے ہیں کہ وہ مجھے جانتے ہیں تو میں گھبرا جاتا ہوں' لیکن پھر جب وہ عزت سے پیش آتے ہیں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کے باوجود ہم مولانا

ڈیزل اور مولانا زلزلہ پسند ہیں۔ مولانا فضل الرحمٰن اس لیے کہ ان پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔ وہ بچپن ہی سے بزرگ چلے آ رہے ہیں۔ جب بھی ڈیزل مہنگا ہوتا ہے' ہماری نظر میں ان کی قدر و "قیمت" بڑھ جاتی ہے۔ قاضی حسین احمد اس لیے پسند ہیں کہ وہ جو کہتے ہیں' کر کے دکھاتے ہیں۔ جیسے ہفتے کے روز قاضی حسین احمد نے ڈسٹرکٹ بار روم مانسہرہ میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ عوام کی متحدہ قوت سے ہم حکمرانوں کے ایوان میں زلزلہ لے آئیں گے۔ اسی وقت یعنی ایک بج کر پانچ منٹ پر زلزلے کے جھٹکے محسوس ہونے لگے۔ شیکسپیئر نے کہا تھا نام میں کیا رکھا ہے۔ تب شاید نام میں کچھ نہ ہوتا ہو' اب تو سب کچھ ہے۔ بے نظیر بھٹو کا نام بے نظیر زرداری ہوتا ہے تو اس کے آدھے ووٹ کم ہو جاتے ہیں۔ شاید اسی لیے تہمینہ دولتانہ نے نواز کھوکھر کو کہا ہے کہ دونوں استعفیٰ دے کر ایک ہی حلقے سے الیکشن لڑیں۔ اگر میں ہار گئی تو اپنا نام بدل کر نواز کھوکھر رکھ لوں گی۔ ایسی ہی شیخ رشید نے کہا ہے "حکومت اسی سال اپنے گھر چلی جائے گی۔ اگر نہ گئی تو میرا نام بدل کر آصف زرداری رکھ دینا۔" اس سے تو لگتا ہے کہ شیخ رشید کوشش کرے گا کہ حکومت اس سال اپنے گھر نہ ہی جائے۔ نواز شریف نے کہا ہے کہ بینظیر حکومت نے جو خزانہ لوٹا ہے' اس کی پائی پائی قومی خزانہ میں دوبارہ جمع نہ کرواؤں تو میرا نام بدل دینا۔ اگرچہ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ پھر انہیں کس نام سے بلایا جائے۔ اس صورت میں تو انہیں بے نظیر ہی کہا جانا چاہیے۔ قاضی حسین احمد کے لیے تو اب بھی دونوں بے نظیر ہی ہیں۔ جماعت اسلامی کے رکن قومی اسمبلی صاحبزادہ فتح اللہ خان تو فرما چکے ہیں کہ جماعت اسلامی نے فاطمہ جناح کے بڑھاپے کے باعث اس کی حمایت کی تھی۔ بے نظیر بھٹو کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں کہ یہ جوان ہے۔ ہمیں تو یہ بیان بے نظیر بھٹو کی تعریف لگتا ہے۔ امریکہ کے ایک محقق نے گالیوں پر کام کیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ عورت کے لیے سب سے بڑی گالی کیا ہے؟ تحقیق کے بعد اس نے کہا: "عورت کے لیے سب سے ناپسندیدہ گالی اسے یہ کہنا ہے کہ وہ بوڑھی ہو گئی ہے۔" بہر حال ہم سیاستدانوں کے ناموں کی بات کر رہے تھے۔ ان کے پاس نام کے علاوہ ہوتا ہی کیا ہے؟ کام بھی تو ان کے برائے نام ہی ہوتے ہیں' لیکن گزشتہ دنوں مولانا زلزلہ قاضی حسین احمد صاحب کا اخبار میں بیان پڑھ کر لگا کہ کسی اور نے بھی اپنا نام قاضی حسین احمد رکھ لیا ہے۔ بیان تھا کہ حکومت چند

روز کی مہمان ہے ہم اسے جلد رخصت کر دیں گے۔ سچی بات ہے یہ بیان کوئی پٹھان دے ہی نہیں سکتا۔ پٹھانوں کے ہاں تو دشمن جان بھی مہمان بن کر آ جائے تو اس کے بھی محافظ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں بڑے شاعر وہ ہوتے ہیں جن کے شعروں کی ہم جیسوں کو سمجھ نہ آئے۔ ایسے ہی قاضی صاحب ہمارے بڑے لیڈر ہیں۔ نواز شریف کو الجبرا اور قاضی صاحب کی بھی سمجھ نہیں آئی۔ جمعیت علماء اسلام کے حافظ حسین احمد نے جنرل جہانگیر کرامت کے بارے میں کہا تھا: "ہماری فوج کے سالار وہ ہیں جو کافی بھی ٹھنڈی کر کے پیتے ہیں۔" قاضی حسین احمد تو وہ لیڈر ہیں جو پانی بھی ابال کر پیتے ہیں۔ اتنی متحرک شخصیت کہ وہ بیٹھے بھی ہوں تو لگتا ہے چل رہے ہیں۔ مستقل مزاج بندے ہیں۔ یاد رہے مستقل مزاجی اس سخت بات کو کہتے ہیں جو آپ اس وقت کرتے ہیں جب سخت محنت کر کے تھک جاتے ہیں۔ قاضی صاحب جس دن کچھ نہ کریں' اس دن انہیں تھکاوٹ ہو جاتی ہے۔ (The State of Pakistan Economy کھولی تو جلد کے اندر کتاب الٹی تھی۔ ہم نے بک شاپ والے سے کہا کہ یہ بائینڈر نے الٹی کر دی ہے تو وہ بولا نہیں' موجودہ حکومت نے کی ہے۔

ہمیں تو اخباروں میں بابا ٹلگی' نصیر اللہ بابر' شیخ رشید' خالد کھرل اور دوسرے اعلیٰ و ادنیٰ وزیروں کے بیان پڑھ کر لگتا ہے کہ پنجابی فلموں کے ڈائیلاگ پڑھ رہے ہیں' لیکن پھر قاضی کا بیان پڑھ کر وہی محسوس ہوتا ہے جو فلموں میں ہمایوں قریشی' ادیب' نصر اللہ بٹ' ...ت چیمہ اور مصطفیٰ قریشی کے بعد سلطان راہی کی بڑھک سن کر محسوس ہوتا ہے۔ قاضی حسین احمد جوانوں میں بہت پاپولر ہیں۔ جس عمر کے جماعت کے امیر ہو گزرے ہیں' اس حساب سے تو قاضی صاحب خود بھی ابھی نوجوان ہی ہیں۔ آندروپوف کی وفات سے قبل 198... ء میں سوویت یونین کے پورٹ بیورو کے گیارہ اراکین میں سے چھ ستر برس سے تجاوز کر گئے تھے۔ صرف گورباچوف ساٹھ برس کے تھے جنہیں سب بچہ سمجھ کر بولنے نہ دیتے۔ شاید اسی لیے جماعت اسلامی کا امیر بننے کے بعد لوگوں نے قاضی صاحب کو جماعت کا گورباچوف کہنا شروع کر دیا۔ گورباچوف تو اب غرباء چوف ہو گیا جب کہ قاضی صاحب تو مخالفین کو در گور باچوف بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ایوان اقتدار اور ایوان انتظار دونوں اس زلزلے سے لرز بھی رہے ہیں۔ اور کچھ پتہ نہیں چل رہا اس زلزلے کا مرکز کہاں ہے؟

مسلح شاعری

چندروز پہلے کی بات ہے ایک نوجوان نقادپاک ٹی ہاؤس میں منیر نیازی پر تنقید کررہاتھا' ایک دانشور نے اس کے کان میں کچھ کہاتو وہ فوراً تعریف کرنے لگا۔ ہم نے دانشور سے "آپ نے کیاکہاتھا؟" وہ بولا: "میں نے کہاتھاکہ منیر نیازی صاحب نے پستول کالائسنس بنوا ہے۔" ہم منیر نیازی کے واقف کار ہیں۔ کچھ کے نزدیک واقف کار اس کو کہتے ہیں جس۔ آپ اتنے واقف ہوں کہ ادھار لے سکیں اور وہ اتناواقف نہ ہو کہ آپ سے ادھار مانگ سکے

بہر حال ہمیں سمجھ نہیں آرہی کہ وہ شخص جس نے زندگی شاعری کے لیے وقف کردی اور شاعری زندگی کے لیے' اسے اب پستول کی کیاضرورت آپڑی۔ کسی شاعر کو سب سے زیادہ خطرہ اپنے پیٹ سے ہوتا ہے۔ انہوں نے کہاہے "مجھے بہت عرصہ پہلے ہی پستول لے لیناچاہیے تھا۔" جس سے لگتاہے اتنے برس وہ پستول کاکام اپنی زبان سے ہی لیتے رہے۔ شاعری کاتو ویسے بھی ہمارے معاشرے میں اس قدر احترام ہے کہ جیب کترے تک شاعر کی جیب نہیں کاٹتے۔ چند برس پہلے کی بات ہے ڈاکوؤں نے فلائنگ کوچ روکی اور ہر کسی کو لوٹنے لگے۔ ہمارے ایک مشہور شاعر اس میں سوار تھے۔ ڈاکوؤں کو انہوں نے بتایاکہ میں فلاں شاعر ہوں توڈاکوؤں نے انہیں لوٹنے سے معذرت کرلی۔ بعد میں شاعر موصوف کے مداحین کہتے رہے کہ ڈاکو تک شاعر موصوف کے مداحین ہیں' جب کہ ناراضگین کہتے رہے کہ ڈاکوؤں نے اس لیے نہ لوٹاکہ یہ شاعر ہیں ان کی تلاشی پروقت کیوں ضائع کریں۔ کراچی کے حالات ایسے ہیں کہ پہلے اس کے ساحل پر بچے ریت سے گھروندے بنایا کرتے تھے' اب قبریں بناتے ہیں۔ سو جب اخترالامان کراچی آئے اور ڈاکوؤں نے ان کی بیاض چھیننے کی کوشش کی تو ہم نے یہیں سمجھاچونکہ کراچی میں زیادہ تر اسلحہ حکومت نے قبضے میں لے لیاہے' سوڈاکو اس لیے بیاض چھینناچاہتے ہوں گے تاکہ آئندہ اخترالامان کاکلام سناکر لوگوں کو لوٹ سکیں' لیکن جب لاہور میں روحی کنجاہی کی چار غزلیں دن دیہاڑے ہتھیالی گئیں توہمیں پریشانی ہوگئی۔ ہمیں روحی کنجاہی بھی بہت پسند ہیں۔ ..نوں اونچاسنتے ہی نہیں اونچاسمجھتے بھی ہیں۔ روحی کنجاہی صاحب نے تو جب سے ہیئرنگ ایڈ لگوالیاہے' تب سے انہیں سننے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی کیونکہ انہیں دیکھ کرہی اب لوگ چلا ر بولنے لگتے ہیں۔ سناہے آج کل وہ اپنی غزلیں بینک میں جمع کروانے کاسوچ رہے ہیں۔ اگرچہ ئی شاعر روحی کنجاہی صاحب سے حسد کرنے لگے ہیں کہ آخر ہماری غزلوں میں کیاکمی ہے؟ اس بار جب پنجاب یونیورسٹی میں کتاب میلہ لگاتو ہمارے ایک وسیع المطالعہ شاعر روز کتب میلے میں جاتے۔ بقول خامہ بگوشی وہ اس لیے بڑے وسیع المطالعہ شاعر ہیں کیونکہ ساراسال مشاعرہ پڑھتے ۔تے ہیں۔ وہ روز سٹال پر اپنی کتابیں جوں کی توں دیکھ کر کہتے: "شاعری دو قسم کی ہے۔ مقبول شاعری اور معقول شاعری اور میں نے کبھی معقول شاعر اور شاعری بکتے نہیں دیکھی۔" ایک ان ملے تو بڑے خوش تھے۔ ہم نے پوچھا: "کیاکوئی کتاب بک گئی؟" بولے: "نہیں۔ ایک چوری

ہوئی ہے۔ سچی بات ہے اس سے میری بڑی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ اب کوئی کسی ایرے غیرے کی کتاب تو چرانے سے رہا۔" سو اس دور میں سب سے زیادہ خطرہ منیر نیازی صاحب کو ہی تھا' سو انہوں نے اپنی شاعری کی حفاظت کے لیے پستول رکھ لیا۔ ممکن ہے پستول کی حفاظت کے لیے انہیں الگ سے ملازم رکھنا پڑے۔ ویسے انہیں کار اور پستول چلانا نہیں آتا۔ سو پستول چلانے کے لیے بھی انہیں کوئی نہ کوئی تو چاہیے ہوگا۔ پولیس پر انہیں اعتبار نہیں' ورنہ ہماری پولیس یوں حفاظت کرتی ہے جیسے پاکستان کے سابق وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان نے ایک پریس کانفرنس میں بتایا۔ ان کے باڈی گارڈ سفید کپڑوں میں بیٹھے تھے۔ ایک صحافی نے پوچھا: "یہ آپ کے ساتھ جو بندہ بیٹھا ہے۔ یہ کون ہے؟" تو سر ظفر اللہ نے اپنے باڈی گارڈ کا تعارف کراتے ہوئے کہا: "یہ وہ بندہ ہے جو اسے شوٹ کرنے کی کوشش کرے گا' جو مجھے شوٹ کرے گا۔" اب شاعر اور ادیب پستول سے ملک کی نظریاتی اور اپنی نظر آتی سرحدوں کی حفاظت کریں گے۔ ہو سکتا ہے آئندہ مزاحمتی شاعری کی بجائے مسلح شاعری ہونے لگے۔ آنے والے دور میں تو آپ کو کسی شاپنگ سنٹر جانا ہوگا تو دو دن پہلے آپ کو وہاں کے پارکنگ لاٹ میں بکنگ کرانا ہوگی۔ اتنی ٹریفک ہوگی کہ سڑک کی دوسری طرف پہنچنے کا ایک ہی محفوظ طریقہ ہوگا۔ وہ یہ کہ بندہ پیدا ہی دوسری طرف ہو۔ شاعر مشاعروں میں یوں زرہ بکتر پہن کر جائیں گے جیسے اگلے مورچوں پر جا رہے ہوں۔ اب ہمیں لگتا ہے کہ یاسین قدرت صاحب مستقبل کے شاعر ہیں۔ جو غزل اور پستول اکٹھی نکالتے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں ہوتا پہلا فائر کس کا کریں گے۔ شہزاد احمد صاحب پر پچھلے برس حملہ ہوا۔ اس کے بعد سے ان کا کوئی شعر پڑھو تو یہی لگتا ہے جیسے آپ پر حملہ ہو رہا ہے۔ ان کو پروین شاکر نے کہا تھا: "شہزاد صاحب سنا ہے آپ بڑے پڑھے لکھے ہیں مگر آپ اپنے کلام سے اس کا دوسروں کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔" دور کے محققوں کے نزدیک تو مسلح شاعری ماضی میں بھی ہوتی رہی ہے۔ ویسے ہماری شاعری میں چھری' نیزہ' تیر' برچھی' تلوار' گولیاں اور دوسرے اسلحے کا ہمیشہ بے دریغ استعمال ہوتا رہا ہے۔ اردو شاعری میں تو اسے محبوب ہی نہیں گردانتے جو گزرتے گزرتے قتل نہ کرتا جائے۔ ایسی شاعری ہمارے ہاں ہی نہیں دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ہوئی۔ چین میں کئی شاعروں کی ایسی شاعری صوبہ ہونان کے تاریخی شہر چینگ دی میں اڑھائی کلو میٹر لمبی دیوار میں چن دی گئی ہے۔ ممکن شاعر نہ ملے ہوں۔ اسے دیوار نظم کا نام دیا گیا

ہے جو شہر کو سیلاب سے بچانے والے ایک پشتے کے طور پر استعمال ہوگی۔ چلو شاعری سے ا کوں کا بچاؤ تو ہوا۔ محقق کوشش کریں تو ممکن ہے وہ مسلح شاعری کے ساتھ ساتھ مسلح شاعر ھی دریافت کر لیں۔ جیسے اثر لکھنوی صاحب نے دریافت کیا کہ کوئی فلسفے اور سائنس کی تھیوری ایسی نہیں جو میر کے کلام میں پوشیدہ نہ ہو۔ غالب کی سائنسی شاعری پر تو سید حامد علی شاہ نے پوری کتاب لکھ ماری ہے' جس سے لگتا ہے Theory of Relativity غالب نے اپنے Relatives سے تنگ آ کر پیش کی تھی۔ بہر حال آج کل لوگ لکھنا نہیں چاہتے' رائٹر بنا چاہتے ہیں۔ حالات ایسے ہیں کہ شعر اور شیئر کے بھاؤ گرتے جا رہے ہیں۔ لیکن شاعری تو نیر نیازی کی شریک حیات ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے پستول کے بغیر جو وقت گزارا' وہ ضائع کیا۔ نہیں ابھی بھی موقع ہے۔ وہ اپنا ماضی بہتر بنا سکتے ہیں کیونکہ جو اس پر یقین رکھتا ہے کہ ماضی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ ہے جس نے ابھی اپنی یادداشتیں لکھی ہی نہیں۔ مانا زندگی اللہ کی نعمت ہے۔ اس کے بغیر تو بندہ بے کار ہے' لیکن وہ شاعر ہی کیا جو مرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ شاعر تو بستر مرگ پر بھی کوئی اچھا چہرہ نظر آ جائے تو فوراً اس پر مرنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ پھر سیاست دانوں نے تو اسلحہ اس لیے رکھا ہے تاکہ عوام سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ ویسے ممکن ہے انہوں نے اس لیے پستول لیا ہو کہ آج کل قبضہ گروپ متنازعہ اور پبلک پراپرٹی پر قابض ہونے میں ذرا دیر نہیں کرتے اور منیر نیازی پبلک پراپرٹی بھی ہیں اور متنازعہ بھی۔

آہ۔ لات موسیقی

موسیقی سے ہمیں تب سے لگاؤ ہے جب ابھی ہم نئے نئے ہوسٹل میں آئے تھے۔ لگاؤ کی وجہ یہ تھی کہ باتھ رومز کی کنڈیاں نہیں تھیں۔ سو نہاتے وقت ہمیں مسلسل گاتے رہنا پڑتا تھا تاکہ باہر والوں کو پتہ چلتا رہے کہ اندر کوئی ہے۔ ہوسٹل کا پانی بھی موسم کے مطابق ہوتا تھا۔ یعنی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں سرد۔ سو اسی حساب سے سر نکلتے۔ پچھلے دنوں ہم نے پٹھانے خان کو گاتے سنا تو ہمیں یاد آگیا کہ سردیوں کے

نوں میں ٹھنڈے پانی سے نہاتے ہوئے ہماری آواز کیسی نکلتی تھی۔ گرمیوں میں یک دم رم پانی آجانے سے اچھا خاصا عالمگیر یک دم عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ہو جاتا ہے۔ صحافت یں آکر ہم نے جب بھی کسی گلوکار کا انٹرویو کیا' سب سے پہلے اس سے یہی پوچھا کہ کیا آپ کے غسل خانے کی بھی کنڈی نہیں تھی؟ لیکن کچھ لوگ تو پیدا ہی گاتے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ان کی آواز سن کر لگتا ہے جیسے کوئی پیدا ہو رہا ہے۔ نصرت فتح علی خان کہتے ہیں: "جب میں بچہ تھا تو میرے والد کی خواہش تھی کہ میں رووُں بھی سر میں۔ اگر سر میں نہ روتا تو ڈانٹ پڑتی۔" مہدی حسن خان صاحب بچپن میں ایسا سر میں روتے کہ والدین چپ کرانے کی بجائے انہیں سننے بیٹھ جاتے۔ البتہ عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی کی والدہ عطا کو فوراً چپ کرادیا کرتیں۔ ہمارے ایک پاپ سنگر کو جب پہلا گیت گانے پر پروڈیوسر نے بیس روپے دیئے تو وہ بولا: "اس سے زیادہ تو میری والدہ مجھے چپ کرانے کے دیتی ہے۔" نور جہاں کہتی ہیں: "جس عمر میں بچے کھلونے کی ضد کرتے ہیں' میں گانے کی ضد کرتی۔" سٹیج پر گاتے ہوئے مختار بیگم کا انداز یہ ہوتا تھا کہ وہ گاتے ہوئے دونوں ہاتھ بلند کرتیں اور اپنے جوتے اتار دیتیں۔ پتہ نہیں کیسے سننے والے ہوتے تھے جو گلوکارہ جوتا اتار دیتی تھی۔ بہر حال نور جہاں مختار بیگم کے جوتے اٹھالیا کرتی تھیں۔ ہمارے ہاں اتنا احترام ہم نے گلوکاروں کا دیکھا یا نمازیوں کا۔ لیکن شہنشاہ غزل پاکستان میں گلوکاروں کے مقام سے پھر بھی نالاں ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا ہے کہ گانے والوں کو بھی پروفیسر کہا جائے۔ یاد رہے اس سے پہلے موسیقاروں نے استاد کہلانا شروع کیا تھا' جس کے بعد سے استادوں نے ٹیچر کہلوانا شروع کر دیا ہے۔ اگرچہ بظاہر لگتا ہے مہدی حسن خان صاحب بادے میں آگئے ہیں۔ انہیں کسی نے کہہ دیا ہے کہ پروفیسر کہلانا کوئی عزت کی بات ہے۔ ہمارے ہاں پروفیسر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ہاتھ دیکھنے اور دوسرے دکھانے والے۔ کچھ پروفیسر عامل سڑکوں پر مجمع لگاتے ہیں۔ کچھ یہ معمول تعلیمی اداروں میں ہے۔ البتہ عام بول چال میں پروفیسر اسے کہتے ہیں جس کی یادداشت کمزور ہو۔ پروفیسر تو بندہ بن سکتا ہے مگر گلوکار بننے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے۔ بالخصوص ہمسائیوں کا۔ کہتے ہیں تصور خانم کو کسی نے کہا: "کوئل پکا کر کھاؤ گی تو تمہاری آواز بالکل کوئل جیسی ہو

جائے گی۔ ''اس نے ایسا ہی کیا اور وہ کوئل نظر آنے لگی۔ کئی گلوکاروں کی حرکتیں دیکھ ہمارا دل کئی بار انہیں پروفیسر کہنے کو چاہتا ہے' لیکن ہم نے یہ کبھی اس لیے نہیں کہا کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔

موسیقی وہ زبان ہے جو دنیا بھر میں مترجم کے بغیر سمجھی جاتی ہے۔ البتہ اس پر حاصل کرنا مشکل ہے۔ ویسے تو دنیا بھر کی زبانوں کے ماہر اور ان پر عبور رکھنے والے کا اپنی بیوی کی زبان پر عبور نہیں ہوتا۔ اب موسیقی سننے کے دور سے دیکھنے کے دور میں ہے۔ جولیس گونکورٹ کی طرح لوگوں کو بھی موسیقی میں جو پسند ہے' یہ وہ حسینائیں ہیں موسیقی سن رہی ہوتی ہیں۔ موسیقاروں کا ایک دوسرے کو داد دینے کا بھی اپنا انداز ہے جیسے لیوپولڈ گوڈوسکی پرفارمنس دے کر باہر نکلا تو اس کے ایک مخالف گلوکار نے کہا: ''آ رات تو آپ نے کمال ہی کر دیا۔ میں نے آپ کو اتنا اچھا گاتے پہلے کبھی نہیں سنا۔'' گوڈوسکی بولا: ''خیر یہ اتنا بھی برا نہیں تھا۔'' میڈم نور جہاں فلموں میں تب سے گانے گار ہیں جب ابھی خاموش فلمیں ہوتی تھیں' لیکن انہیں بھی ملکہ ترنم ہی کہا گیا' پروفیسر کہلا سکیں۔ ایسے ہی جیسے یاسر عرفات کا برس ہا برس یہ معمول رہا کہ وہ ہر رات بستر بدا لیتے۔ اس حساب سے انہیں فادر آف دی نیشن ہونا چاہیے تھا لیکن وہ تا حال ایک بچی فادر ہی ہو سکے ہیں۔

ہم موسیقی کو روح کی دوا سمجھتے ہیں۔ مہدی حسن صاحب نے فرمایا تھا: ''میں ر سے کئی بیماریوں کا علاج کر سکتا ہوں۔'' سو اس لحاظ سے انہیں پروفیسر کی بجائے ڈاکٹر چاہیے تھا۔ ڈاکٹر اور گلوکار کے نزدیک دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو کھا ہیں اور دوسرے جو نہیں کھانستے۔ کہتے ہیں ''گھر میں ہفتہ قوالی کراؤ تو ملیریا نہیں ہوتا۔ مخالفین موسیقی اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ سارے مچھر قوالوں کی تالیوں سے مر ہیں۔ اگرچہ جب سے پی ایچ ڈی ڈاکٹروں کی تعداد بڑھی ہے' تب سے ڈاکٹر ہونا بھی احتیا طلب ہو گیا ہے۔ ازبکستان میں تو ایم بی بی ایس ڈاکٹر بھی اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر نہیں لکھتے ویسے احتیاط کا تقاضا بھی یہ ہے۔ آج کل سپیشلسٹ ڈاکٹروں کا دور ہے۔ سپیشلسٹ وہ ہوتا جو کم سے کم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتا ہے۔ اس حساب سے ڈاکٹر عارف لو

امراض چمٹا' ڈاکٹر عبدالستار تاری ماہر امراض طبلہ' سجاد علی ماہر امراض پٹھہ و اعصاب اور ڈاکٹر نصرت فتح علی خان ماہر امراض پیٹی و پیٹ اور ڈاکٹر عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی ماہر امراض سر درد کہلاتے۔

ہم نے ایک جرنلسٹ سے پوچھا: ''مہدی حسن کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟'' بولے: ''مجھے تو وہ بہت پسند ہیں۔ خاص کر کے ان کی شاعری۔'' ہم نے بھی مہدی حسن کی ئی غزلیں دیوان میر میں پڑھیں۔ مزا آ گیا۔ وہ شہنشاہ غزل ہیں اور ان کے ساتھ وہی سلوک ہو رہا ہے جو جمہوریتوں میں شہنشاہوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کی غزلیں سن کر ہم یوں حیرت زدہ ہوتے ہیں جیسے کسی پروفیسر عامل سے اپنے مستقبل کا سن کر۔ مہدی حسن کہتے ہیں ''میں ایک بار اپنے شاگرد پرویز مہدی کو گانا سکھا رہا تھا۔ میں نے ایسی تان گائی کہ سامنے پڑا گلاس ٹوٹ گیا۔'' ان میں اور بھی کئی پروفیسر والی خوبیاں ہیں۔ تجریدی آرٹ اتنا برا نہیں' جتنا نظر آتا ہے۔ ایسے ہی کلاسیکل موسیقی اتنی بری نہیں جتنی سننے میں آتی ہے۔ ہم کلاسیکل موسیقی یوں سنتے ہیں جیسے کسی پروفیسر کی باتیں سن رہے ہوں۔ اس کے باوجود اگر کوئی پوچھے کہ گلوکاروں کو کیا کہا جائے؟ تو ہم یہی کہیں گے: ''انہیں کچھ نہ کہا جائے۔''

حسین ہونا منع ہے

ہم نے ایک بار حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس میں کہہ دیا کہ بدصورتی عورت کی سب سے بڑی محافظ ہے۔ تو وہاں موجود ایسی "محفوظ" خواتین نے ہمیں اپنے لیے خطرہ قرار دے دیا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب تو اپنے ایک افسانے میں لکھتے ہیں: "جب خدا کسی غریب سے ناراض ہوتا ہے تو اسے خوبصورت بیٹی دیتا ہے۔" کچھ ایسے ہی خیالات ملائشیا کے صوبہ کینٹین کے وزیراعلیٰ کے ہیں جنہوں نے خواتین سرکاری ملازمت کے لپ اسٹک لگانے

پابندی عائد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ دفتروں میں پرکشش عورتوں کو ملازمتیں نہیں دی جائیں گی۔ لگتا ہے دل کے بعد اب ملائشیا کو بھی حسن سے خطرہ ہے۔ ہم نے صوبہ کینٹین کے وزیراعلیٰ تو نہیں دیکھے۔ ہمارا خیال ہے بادشاہی مسجد کے مولانا عبدالقادر آزاد کی طرح حسین ہوں گے۔ مولانا عبدالقادر آزاد جو ایک عرصے سے ذہانت اور خضاب میں مبتلا ہیں، کہتے ہیں: "ایک وقت ایسا تھا شادی کی تقریب میں میرے حسن کی تاب نہ لا کر ایک لڑکی بے ہوش ہو کر گر پڑی تھی۔ اب تو ظالم وقت نے سب چھین لیا۔" ویسے یہ مولانا کی کسرنفسی ہے ورنہ تو انہیں دیکھ کر کئی لڑکیاں اب بھی بے ہوش ہو سکتی ہیں۔ خیر وہ تو مولویوں کی رولز رائس ہیں، یعنی مولویوں میں ان کو وہی مقام حاصل ہے جو عام گاڑیوں میں رولز رائس کو۔ بہر حال ملائشیا حکومت کے اس اعلان سے وہی نتیجہ نکلے گا جو اسلامی نظریاتی کونسل کے اس اعلان سے نکلتا ہے جس کے مطابق صرف 35 سال سے زیادہ عمر کی عورتوں کو ملازمتیں ملنا چاہئیں۔ عمر عورتوں کی مردانہ کمزوری ہے۔ ایک خاتون کے بارے میں آسکر وائلڈ نے کہا تھا: "جب تک وہ اپنی بیٹی سے دس سال چھوٹی نظر آتی رہے گی، تب تک وہ مکمل اطمینان سے رہے گی۔" عورتیں ہمیشہ کم عمر پسند کرتی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی عمر مردوں سے ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ عورتوں کی کوئی بیوی نہیں ہوتی۔ بہر حال جس خاتون کو کہا جائے گا کہ اسے نوکری اس لیے مل رہی ہے کہ وہ 35 سال سے زیادہ عمر کی ہے تو وہ نوکری لینے سے انکار کر دے گی۔ ایسے ہی صوبہ کینٹین کی عورتیں اس لیے نوکری کرنا ہی نہ چاہیں گی کہ لوگ سمجھیں گے، وہ پرکشش نہیں۔ اس اعلان پر ملائشیائی مردوں نے احتجاج کیا ہے۔ مغرب میں تو آزادی نسواں کی تحریک بھی مردوں نے چلائی تھی تاکہ دفتروں میں وہ عورتوں کے شانے کے ساتھ شانہ ملا کر کام کر سکیں۔

عورتیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جن کے آپ خواب دیکھتے ہیں اور دوسری وہ جن سے آپ کی شادی ہوتی ہے۔ کہتے ہیں آرٹ وہ چیز ہے جو آپ کو دیکھنے میں اچھی لگے، لیکن آپ کو اس کی سمجھ نہ آئے۔ دنیا میں آرٹ کا سب سے پہلا نمونہ عورت ہے۔ کچھ نے تو اتنا میک اپ کیا ہوتا ہے کہ وہ صادقین کے آرٹ کا نمونہ لگتی ہیں۔ عورت ہونا دراصل حسین

ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی آئینہ کسی بھی عورت کو بدصورت نہیں بناتا۔ منیر نیازی صاحب تو کسی بدصورت سے ملنے پر تیار نہیں ہوتے۔ ویسے وہ جن خواتین کو سامنے بٹھا کر تعریفیں کر رہے ہوتے ہیں' انہیں دیکھ کر لگتا ہے دنیا میں کوئی خاتون بدصورت ہوتی ہی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں خوبصورتی تو اندر ہوتی ہے۔ مثلاً جام کے اندر' جیب کے اندر' لباس کے اندر وغیرہ وغیرہ۔ کچھ کے نزدیک خوبصورت دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتی ہے۔ سو صوبہ کینٹین کے وزیراعلیٰ کو اس آنکھ پر آنکھ رکھنی چاہیے تھی۔ جیسے ایک پاکستانی لڑکی نے بتایا: "میں امریکہ میں شلوار قمیض میں دفتر جاتی تو سب کی آنکھیں میرے چہرے کو گھورتی رہتیں۔ میں نے باس سے شکایت کی تو اس نے کہا' منی اسکرٹ یا شاٹس پہنا کرو۔ اب چھ ماہ ہوگئے ہیں۔ دفتر میں کسی نے میری آنکھ میں آنکھ ڈال کر نہیں دیکھا۔" اگرچہ یہ پتہ کرنا بھی مشکل ہے کہ کونسی لڑکی دلکش ہے' کون سی نہیں۔ روس میں اس کا یہ طریقہ ہے کہ بازار یا ہوٹل میں جس سیلز گرل سے گاہک بقایا مانگے' وہ سمجھتی ہے اب میں دلکش نہیں رہی۔

ہو سکتا ہے حکومت کا دفتروں میں حسن پر پابندی لگانے کا فیصلہ اصل میں بیوٹی پارلرز کے خلاف مہم ہو۔ جو شخص کہے کہ عورتوں میں خوبصورتی کم ہوتی جا رہی ہے۔ یقین کر لیں وہ کسی بیوٹی پارلر میں کام کرتا ہے۔ وہاں کام کرنے سے بندے کا بیوٹی سے یقین اٹھ جاتا ہے اور محنت پر یقین آ جاتا ہے۔ دنیا کو اتنا حسن شاعروں' موسیقاروں نے نہیں دیا جتنا بیوٹی پارلروں والوں نے دیا ہے۔ البتہ اگر بیوی ہفتہ بیوٹی پارلر سے دور رہے تو اسے پتہ بھی نہ ہوگا کہ محلے میں کیا ہو رہا ہے۔ عورتیں معجزوں پر یقین رکھتی ہیں۔ یقین نہ آئے تو کسی بیوٹی پارلر میں چلے جائیں۔ ہماری ایک عزیزہ لطیفے بہت گھڑتی رہتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہم نے اس کے چھوٹے بھائی سے پوچھا: "وہ اب بھی لطیفے بناتی ہے؟" تو وہ بولا: "نہیں۔ اسے تو بیوٹی پارلر کی ملازمت چھوڑے عرصہ ہوگیا ہے۔" فرانس کا اتنا دفاعی بجٹ نہیں ہوتا' جتنے کا ہر سال فرانسیسی عورتیں میک اپ کر جاتی ہیں۔ لیکن میک اپ پر پابندی خواتین کو غیر مسلح کرنے کے مترادف ہے۔ ملائشیا حکومت کے اس اعلان کے بعد اب وہاں ماں باپ اپنے بچوں کی شادی کرنے کے لیے جو ضرورت رشتہ کا اشتہار دیں گے' ان میں لکھا ہوگا کہ ہماری بیٹی اتنی حسین ہے کہ کئی دفتروں نے اسے نوکری دینے سے انکار کر دیا ہے۔ ویسے تو

ہماری خواتین کی طرح ملائشیا کی خواتین کو بھی مردوں سے زیادہ آسانیاں حاصل ہیں۔ جیسے کئی مرد ایک عورت سے شادی نہیں کر سکتے' جب کہ کئی عورتیں ایک مرد سے شادی کر سکتی ہیں۔ اب وہاں صرف بیوی کی جاب ایسی رہ گئی ہے جس پر خوبصورتی کو ترجیح ملے گی' لیکن کچھ خواتین صرف آٹھ گھنٹے والی جاب چاہتی ہیں۔ جہاں تک لپ اسٹک کا تعلق ہے تو اسے ہونٹوں کا لباس سمجھتے رہے' لیکن صوبہ کینٹین کے وزیراعلیٰ اسے وہ اسٹک سمجھتے ہیں جس سے عورتیں مردوں کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اب لپ اسٹک لگانا وہاں غیر اخلاقی حرکت ہے۔ جیسے ڈنمارک میں عورتوں کا موٹا ہونا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں ان حرکتوں سے پشتو فلم بنتی ہے۔

اگرچہ لپ اسٹک پر پابندی لگانے سے زرمبادلہ بچے گا کیونکہ صرف صوبہ کینٹین کے مرد روزانہ لاکھوں کی لپ اسٹک کھا جاتے ہیں' لیکن اس کے باوجود وہاں کے مردوں نے اس کی حمایت میں کوئی جلوس نہیں نکالا۔ صرف اخباروں نے ہی "سرخی لگانے پر پابندی" کی سرخی لگائی۔

ضرورت سر رشتہ

وہ تحریر جسے ایک کالم نگار لکھتا ہے کالم ہوتی ہے۔ایسے ہی وہ حرکت جو ایک سیاستدان کرے سیاست کہلاتی ہے۔اگرچہ سابق وفاقی وزیر عبدالستار لالیکا اپنی حرکات کی وجہ سے اتنے مشہور نہیں جتنے سکنات کی وجہ سے ہیں۔اس کے باوجود انہوں نے کرپشن کی پیکنگ کا جدید طریقہ دریافت کر کے ہمیں اتنا حیران کیا ہے کہ ہم تب سے انہی کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔انہوں نے تحقیق کے بعد کہا ہے:"کرپشن کی چیکنگ کے لیے آپ

ضرورت رشتہ کے اشتہار دیکھیں جن میں اکثر یہ لکھا ہوتا ہے کہ کھاتے پیتے گھرانے کی لڑکی کے لیے ڈاکٹر یا انجینئر یا سرکاری ملازم کا رشتہ درکار ہے۔یہ نہیں لکھا ہوتا کہ سرکاری ملازم گریڈ 17 کا ہو یا نیچے کا کیونکہ انہیں پتہ ہے گریڈ جو بھی ہوگا'اوپر کی آمدنی کافی ہوگی اور لڑکی خوش رہے گی۔اسی لیے ضرورت رشتہ کے اشتہار میں کبھی کسی سیاستدان کی ڈیمانڈ نہیں ہوتی۔"اس تحقیق سے تو لگتا ہے وہ برسوں سے ضرورت رشتہ کے اشتہار ہی پڑھ رہے ہیں۔ویسے بھی یہ اشتہار کنواروں سے زیادہ شادی شدہ پڑھتے ہیں'لیکن لالیکا صاحب کے بیان کے بعد تو ضرورت رشتہ کے اشتہاروں کے مطالعہ کے لیے الگ سے سر رشتہ چاہیے۔کم از کم محکمہ انٹی کرپشن کو تو یہ اشتہار زبانی یاد ہونے چاہئیں۔

کرپٹ کا لفظ ہمارے ہاں استعمال ہو ہو کر اب اتنا کرپٹ نہیں رہا جتنا شروع میں ہوتا تھا۔کرپشن کس نے شروع کی؟اس پر بے نظیر اور نواز شریف دونوں میں مکمل اتفاق رائے ہے۔جب نواز شریف سے ان کے دور حکومت میں یہ پوچھا گیا تو انہوں نے کہا: "پچھلی حکومت نے۔"اب بے نظیر بھٹو بھی یہی کہتی ہیں۔ٹریفک اور سیاست کے حادثے میں یہ فرق ہوتا ہے کہ ٹریفک کے حادثے میں مجرم وہ ہے جو زندہ بچ جائے اور سیاست میں اس کے الٹ ہوتا ہے۔ہماری تو حکومت خود ایسے چل رہی ہے جیسے ہماری ٹریفک۔لیکن کچھ لوگوں کی خواہشیں اس دور حکومت میں آکر پوری ہوئیں جیسے ہمارے ایک دوست کی خواہش تھی کہ اس کے پاس مہنگی گاڑی ہو اور وہ کسی مہنگے فلیٹ میں رہے۔اس کی دونوں خواہشیں پوری ہو گئی ہیں۔سوزوکی مہنگی ہو گئی ہے اور اس کے مالک مکان نے کرایہ ڈبل کر دیا ہے۔

سیاستدان دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو سیاست میں کچھ کرنے آتے ہیں اور دوسرے وہ جو کچھ بننے آتے ہیں۔ہمارے سیاست دانوں کو وطن نے جو دیا'اس کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔اور انہوں نے وطن کو جو دیا'اس کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔سو کے نوٹ پر قائداعظم کی جو تصویر ہے'اب تو اس میں وہ نوٹ رکھنے والے کے ساتھ آنکھ نہیں ملا رہے۔جس سے لگتا ہے کہ اب انہیں بھی پتہ چل گیا ہے کہ یہ نوٹ زیادہ کن لوگوں کے پاس ہیں۔ازبیک زبان میں معیشت کا مطلب عیش و عشرت ہے۔ہمارے

حکمرانوں نے عیش و عشرت کو معیشت بنا دیا۔ ہمارے ایک جاننے والے اسلام آباد میں افسر ہیں۔ ہم نے ان سے پوچھا: "نئے سیاسی لطیفے سنے؟" بولے: "سنے کیا مطلب! ایک دو کے ساتھ تو میں نے کام بھی کیا۔" سیاست دانوں کے بارے میں لوگوں کی رائے ایسی ہے کہ ایک بزرگ سیاستدان پاؤں پھسلنے سے گر پڑے۔ ان کا ورکر پاس کھڑا آرام سے دیکھتا رہا۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولا: "میں انہیں جانتا ہوں' کچھ دیکھ کر ہی گرے ہوں گے۔" جہاں تک سیاست دانوں کی ضرورت رشتہ کے اشتہاروں میں ڈیمانڈ نہ ہونے کی وجہ ہے۔ یہ وہ بھی ہو سکتی ہے جو اداکارہ ریشم نے اپنے انٹرویو میں کہی ہے کہ میرا دلہا فلم انڈسٹری سے نہیں ہو گا بلکہ میں کسی تعلیم یافتہ اور مہذب شخص سے شادی کروں گی۔ ویسے یہ بھی نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ضرورت رشتہ کے اشتہاروں میں سیاست دانوں کا کوئی سکوپ ہی نہیں ہوتا۔ کئی اشتہاروں میں لکھا ہوتا ہے کہ دوسری شادی اور بچوں والے بھی رابطہ کر سکتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں ہر شادی کامیاب ہوتی ہے۔ ناکام تو بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ہوتا ہے۔ سیاست دان تو اس لیے بھی طلاق نہیں دیتے کہ ایک ووٹ کم ہو جائے گا۔ کچھ تو اسی طرح ایک ایک کر کے ووٹ بڑھاتے ہیں۔ ووٹوں اور ووٹیوں میں اضافہ کرنے والے ایک سیاست دان کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بچپن ہی سے اتنے تیز تھے کہ بیک وقت دو درختوں پر چڑھ سکتے تھے۔ پاکستان میں شادی کے اشتہارات شاید اس لیے چھپتے ہیں کہ یہاں آپ لڑکی کے والد سے اس کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ کئی مغربی ملکوں میں تو ہالی وڈ کی طرح لڑکی کے خاوند سے اس کا ہاتھ مانگتے ہیں۔ انگریزی زبان میں تو ویسے بھی طلاق شادی سے پہلے آتی ہے۔ وہاں ایک معروف جوڑے کی شادی ہو جائے تو وکیلوں کا ایک جوڑا خوشحال زندگی گزار سکتا ہے۔ ہالی وڈ میں اگر جوڑا چرچ سے شادی کے بعد اکٹھا باہر نکلے تو سوچا جاتا ہے شادی چلنے کے چانسز ہیں۔ کہتے ہیں ایک چالاک آدمی کو ایک احمق عورت بھی سنبھال سکتی ہے' لیکن ایک بے وقوف کو سنبھالنے کے لیے بڑی عقل مند عورت چاہیے۔ سیاست دانوں کی ڈیمانڈ شاید اس لیے بھی کم ہوتی ہے کیونکہ ان کی تو بات پر بھی تب تک یقین نہیں کیا جا سکتا جب تک وہ اس کی باضابطہ تردید نہ کر دیں۔ آپ کسی عام بندے سے جان چھڑانا چاہتے ہیں تو

اسے قرض دے دیں وہ پھر آپ کو نظر ہی نہ آئے گا اور اگر کسی بڑے آدمی سے یہ چاہتے ہیں تو اسے ووٹ دے دیں پانچ سال آپ کے متھے نہ لگے گا۔ سیاست دان کبھی وہ نقصان نہیں اٹھاتا جو وہ نہ اٹھانا چاہے۔ آج کل بندوں کو جس بات پر شک ہو' کہتے ہیں اس میں کوئی سیاست ہے۔ سو شادی کے اشتہاروں میں سیاست دانوں کی ڈیمانڈ نہ ہونا بھی ایک سیاست ہے۔ کیونکہ سیاست دان تو ہمارا قومی سرمایہ ہیں اور شاید یہ سرمایہ پاکستانی کرنسی میں ہے۔ اسی لیے دن بدن ان کی ویلیو کم ہو رہی ہے۔ ہم نے جب بھی تجریدی مصوری دیکھی' وہ کسی مجرد کی تخلیق لگی۔ سیاست بھی ہمیں تجریدی آرٹ لگتی ہے۔ جیسے اکثر اداکار کہتے ہیں کہ ہماری تو فن سے شادی ہو چکی ہے۔ ایسے ہی سیاست دانوں کی اصل شادی تو سیاست سے ہوتی ہے۔ کم از کم سیاست کے ساتھ ان کے سلوک سے تو ہمیں یہی لگتا ہے۔

انتظاریہ

انتظاریہ صاحب ہمارے وہ افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں کا انتظار ہوتا ہے۔
ایسے ادیب کہ بندہ ان سے آلوؤں کا بھاؤ پوچھے تو اس کا جو جواب دیں گے' وہ ادب ہوگا۔ جیسے چین جانے والوں کو بریف کیا جاتا ہے کہ وہاں مزاحیہ بات نہ کرنا کیونکہ چینیوں کا مزاح اتنا مختلف ہے کہ میزبان آپ کی مزاحیہ باتوں سے برا منا سکتا ہے۔
ایسے ہی انتظار حسین سے ملنے جانے والوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ ان سے ادبی گفتگو سے

پرہیز کرنا' ورنہ بھول جاؤ گے کہ کس کام آئے تھے۔ انتظار صاحب ماضی کے انتظار میں رہتے ہیں۔ انہیں پرانی چیزیں اچھی لگتی ہیں۔ ہم سمجھتے تھے یہی ان کی خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز ہے لیکن مسز انتظار حسین نے اور ہی بات بتائی ہے۔ ایک ہفت روزے کو انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا: ''میں نے کبھی انتظار کے افسانے نہیں پڑھے۔'' مزید کہتی ہیں: ''جب مجھے پتہ چلا کہ ان سے میری شادی ہو رہی ہے تو پہلے میں نے انکار کر دیا کہ ایسے شخص سے شادی نہیں کروں گی جو شہر کے گٹروں کے ڈھکن گنتا پھرے۔'' صاحب ہمیں انتظار حسین صاحب کے ان مشاغل کا تو پتہ نہیں' البتہ ان کی افسانہ نگاری کے قائل ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں اچھے افسانہ نگار میں اچھے خاوند بننے کی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ کیونکہ رات دیر سے گھر آنے پر ہر روز نئی کہانی زیادہ آسانی سے بنا سکتا ہے۔ یاد رہے کہانی یا افسانے اور حقیقت میں یہ فرق ہے کہ کہانی یا افسانہ بے تکا نہیں ہوتا۔ البتہ تجریدی افسانہ وہ ہوتا ہے جسے سمجھنے کے لیے لکھنے والے کو بھی اسے کئی دفعہ پڑھنا پڑتا ہے۔ کچھ کا غیر شاعرانہ خیال ہے کہ اگر خاتون تین ہزار مہینے کے لے کر گھر کا کام کرے گی تو یہ نوکری ہوگی۔ اگر اس کے بغیر کرے تو یہ شادی ہے۔ انتظار حسین صاحب ایسی شخصیت ہیں کہ میاں بیوی بیٹھے ہوں تو پوچھنا پڑتا ہے کہ تم دونوں میں سے میاں کون ہے؟ مسز انتظار حسین سخت نہیں ہیں ورنہ انتظار حسین صاحب کو کشور ناہید سے پردہ کرواتیں۔ کشور ناہید اور انتظار حسین کے ایسے تعلقات ہیں کہ کبھی وہ کشور کی بات مان لیتے ہیں۔ کبھی کشور اپنی بات منوا لیتی ہیں۔ کشور ناہید ادب کی مردانہ آواز ہیں۔ ایک نجی تقریب میں انتظار صاحب کو ''مصروفہ'' نے ڈانٹ دیا تو مسز انتظار نے برا مناتے ہوئے کہا کہ آپ نے انہیں کیوں ڈانٹا۔ یہ میرے خاوند ہیں۔

ہماری ادبی تاریخ شاعروں' ادیبوں کی بیویوں کی شکایتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگرچہ شادی کی اپنی بڑی خوبیاں ہیں' بندے میں وفاداری' قوت برداشت خود پر قابو پانے کی صلاحیت اور دوسری بہت سی خوبیاں پیدا ہو جاتی ہیں' جن کی بندے کو ضرورت ہے نہ ہوتی اگر اس کی شادی نہ ہوتی۔ ہم اکثر سوچتے تھے شاعروں اور

ادیبوں کی تحریروں میں اتنا سوز و گداز کہاں سے آتا ہے۔ جب سے ان کے فیملی
چھپنے لگے ہیں۔ تب سے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا ہے۔ ایک تحقیقی رپورٹ کے مطابق
شادی شدہ کنواروں سے پانچ سال زیادہ زندہ رہتے ہیں۔ صاحب پانچ سال بچانے
لیے ساری زندگی صرف کر دینا اگرچہ کوئی عقل مندی نہیں، بہر حال کہتے ہیں شادی
شدہ شاعر کنوارے شاعر سے زیادہ زندہ رہتا ہے۔ البتہ افسانہ نگار کے بارے میں
نہیں کہا گیا۔ تاہم جن شاعروں، ادیبوں کی ازواجی زندگی کامیاب رہی، ان میں
بیشتر وہ ہیں جن کی بیویاں خاوندوں کی تحریریں نہیں پڑھتی تھیں۔ ہمارے ہاں تو
بھی تب تک دوسرے کی تحریر نہیں پڑھتے جب تک انہیں اس پر سرقے کا گمان
ہو۔ رائٹر کی بیوی اگر اس کی تحیریریں نہ پڑھے تو بندہ آسانی سے لکھتا ہے۔ شاید اسی
لیے انتظار حسین آج بھی ویسا ہی لکھ رہے ہیں جیسا انہیں لکھنا چاہیے۔ ہم تو انہیں تب
اردو کا بہت بڑا افسانہ نگار مانتے تھے، جب ابھی ہم نے ان کے افسانے نہیں پڑھے
تھے۔ ان کے افسانے پڑھنے کے بعد بھی ہم نے اپنی رائے نہیں بدلی۔ ہمیں ان کے
افسانے اس قدر پسند ہیں کہ رات کو جب تک ان کی کوئی کتاب نہ کھولیں، نیند نہیں
آتی۔ لیکن ہم مکمل طور پر انہیں کبھی نہ پڑھ سکے کیونکہ جب بھی ہم پڑھنے لگتے ہیں
کوئی نہ کوئی آ کر ہمیں جگا دیتا ہے۔ ان کے خیالات ڈارون کے برعکس ہیں۔ ڈارون کو
پڑھو تو وہ کہتا ہے انسان بندر سے بنا ہے۔ انتظار حسین کو پڑھو تو لگتا ہے، انسان بندر بن
رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں افسانہ تب بھی ہوتا تھا جب افسانہ نگار بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کل
بھی ہمارے محلوں میں جو "افسانے" مشہور ہوتے ہیں، وہ سارے افسانہ نگاروں کے
تو نہیں ہوتے۔

بیگم انتظار حسین نے کہا: "اگر وہ لاپروانہ ہوں تو ہیرا ہیں۔" جس پر انٹرویو لینے
والے صحافی نے کہا: "گویا لاپروا ہیں، ہیرا نہیں۔" صاحب ہمیں دکھ ہوا کہ انتظار
حسین ہیرا بننے سے بال بال رہ گئے۔ محترمہ نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ انتظار حسین
سنتے بھی کم ہیں۔ ہم سمجھتے تھے انتظار حسین صرف بولتے ہی کم ہیں۔ بہر حال اس سے یہ
پتہ چلتا ہے کہ انتظار، صاحب طرز افسانہ نگار ہی نہیں، صاحب طرز شوہر بھی ہیں۔ یہ

یو شاعروں، ادیبوں کی بیویوں کے لیے مشعل راہ ہے کہ اگر وہ کامیاب ازدواجی
ی چاہتی ہیں تو خاوند کی تخلیقات پڑھنے سے پرہیز کریں۔ ہمیں اپنے بے شمار ادیب
آ رہے ہیں جن کی طلاقیں ہو چکی ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ وجہ یہی ہوگی کہ ان کی
یوں نے ان کی تحریریں پڑھ لی ہوں گی۔ برنارڈ شا نے کہا تھا کہ رائٹر کی تحریریں ان
ی ازدواجی زندگی بنانے کی بجائے بگاڑنے میں زیادہ اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ خاص کر
ے وہ تحریریں جنہیں وہ پوسٹ کرنا بھول جاتے ہیں۔

خواجہ سگ پرست

پیپلزپارٹی کے خواجہ نصرالدین یعنی شیخ رفیق کو ہم نے جب بھی دیکھا کھاتے دیکھا یا بولتے ہوئے۔ ان کی باتیں باسروپا ہوتی ہیں یعنی ان میں بھی سری پایوں کی لذت ہے۔ اسی لیے دیر سے ہضم ہوتی ہیں۔ جیسے ان کا یہ بیان کہ اگر میرے کتے کا ووٹ ہوتا تو مجھے ہی ووٹ ڈالتا۔ اگرچہ یہ جملہ شیخ صاحب سے کہیں زیادہ کتے کی تعریف میں ہے۔ ہاں اگر کتا خود کہتا کہ میں شیخ صاحب کو ووٹ دوں گا تب شیخ صاحب اس پر فخر کر سکتے تھے، جیسے

سلمان رشدی نے اپنی کتاب Imaginary Homeland میں لکھا ہے: "اگر مجھے ووٹ دینا ہوتا تو میں بے نظیر بھٹو کے حق میں ووٹ دیتا۔" شیخ رفیق صاحب سگ رفیق ہیں۔ ویسے بھی انسان کتے کا بہترین ساتھی ہے۔ شیخ صاحب کا کتا بڑا ذہین ہے جس کی ذہانت کے ہم اسی دن قائل ہوگئے تھے جس روز اس نے شیخ رفیق کو کاٹ لیا تھا۔ بقول شخصے کتے نے ان کا اخبار میں ایک بیان پڑھ لیا تھا۔ بہرحال شیخ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کا کتا اس قدر ذہین ہے کہ ان کے گھر پیجارو والے آئیں تو ان کا بڑا احترام کرتا ہے۔ کوئی عام گاڑی میں آئے تو اسے ایک نظر دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے۔ کوئی موٹر سائیکل والا آئے تو اس پر خوب بھونکتا ہے۔ اگر کوئی پیدل آجاتے تو اسے کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگرچہ اس سے تو یہی لگتا ہے کہ سگ رفیق پہلے ٹریفک پولیس میں رہا ہے۔ اس حساب سے تو شیخ صاحب کا اپنے گھر میں پیدل پھرنا مشکل ہوگیا ہوگا۔ ویسے تو وہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے بھی "پیدل" ہی لگتے ہیں۔

سیاست دان اور اداکار کتوں کے بڑے فیورٹ ہوتے ہیں۔ بعض سیاستدانوں کے گھر جاؤ تو ان کے ہاں آپ کو کتے نظر نہیں آتے، لیکن ان کے رویئے سے لگتا ہے کہ ان کے ہاں ہیں ضرور۔ سابق صدر بش کا کتا تو ان کے بقول کلنٹن سے زیادہ خارجہ پالیسی کا علم رکھتا تھا۔ ہو سکتا ہے یہ خوبی شیخ صاحب کے کتے میں بھی ہو۔ شیخ صاحب بھی خارجہ پالیسی پر بول رہے ہوں تو دوسرے سمجھتے ہیں بیمہ پالیسی پر بات کر رہے ہیں۔ سپار ماڈل سینڈی کرافورڈ تو وال کلیمر کے ساتھ اپنی "عبوری شادی" میں اس شرط پر رہ رہی ہے کہ اگر اس کے تین کتے، ایک بلی اور ایک گھوڑا وال کے کتوں ار سور کے ساتھ مفاہمت کرلیں تو وہ شادی کرلیں گے۔ ہم بھی اس حق میں ہیں کہ حیوانات کے ساتھ انسانی سلوک نہیں ہونا چاہیے۔ سیاست دانوں کو انہیں اپنی تقریریں نہیں سنانا چاہئیں۔ ایک زمانے میں کتا گیتوں والے ریکارڈ پر بیٹھا گیت سنا کرتا تھا، جس پر لکھا ہوتا تھا: "ہنر ماسٹرز وائس" پھر ایسے ایسے گانے والے آئے کہ کتا ریکارڈوں سے غائب ہوگیا۔ اسی وجہ سے کئی کتے سیاست دانوں کے گھروں سے بھی غائب ہوئے، لیکن شیخ رفیق کا کتا بڑا کتا نکلا۔ وہ سیاست بھی سمجھتا ہے۔ شیخ صاحب کو سیاست اپنے کتے سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ خود فرماتے ہیں سہاگ رات کو کمرہ عروسی میں جا کر اپنی اہلیہ فردوس رفیق سے پوچھا: "نواب ممدوٹ کو جانتی ہو؟" اس نے کہا: "ہاں۔" تو شادی چلی۔

جب پنجاب میں نظام مصطفیٰ کے بجائے نظام مصطفیٰ کھر تھا' ان دنوں شیخ رفیق کے ایک او
ور کرنے سہاگ رات کو کمرۂ عروسی میں جا کر بیوی سے پوچھا: "کھر کو جانتی ہوا" تو محترمہ نے
موصوف کو حجلہ عروسی سے باہر نکال دیا اور صبح ہوتے ہی طلاق لے لی کہ تم نے آخر مجھے
سمجھا کیا ہے؟ شیخ رفیق صاحب گھریوں چلاتے ہیں جیسے پارٹی چلا رہے ہوں۔ کھانا خود پکاتے
ہیں۔ روزانہ صبح اٹھ کر دس فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتے ہیں۔ ہم نے جب بھی ان کا
بیان پڑھا' ہمیں یہی لگا وہ روزانہ کافی بلندی سے نیچے گرتے ہیں۔ معصوم آدمی ہیں' سنا ہے
ایک بار کسی عرب ملک گئے تو آ کر بتانے لگے میں وہاں اتنا مشہور ہوں کہ ابھی ایئرپورٹ سے
باہر ہی نکلا تھا کہ ٹیکسی ڈرائیور نے دور سے مجھے پہچان کر میرا نام لے کر بلانا شروع کر دیا۔ "
رفیق! یا رفیق!" بازار گیا تو بیشتر دکاندار مجھے پہچان کر میرا نام لے کر مجھے بلاتے رہے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں: "میری فٹنس کا راز یہ ہے کہ میں نے اڑھائی سال تک والدہ کا
دودھ پیا۔ اس دوران میں چلا اور نہ ہی بولا۔ میری والدہ کہتیں کہ اس کی پیدائش کا کوئی فائدہ
نہیں۔ والدہ مجھے ایک پیر کے پاس لے گئیں جس کی دعا سے میں نے بولنا شروع کر دیا اور یہ
سلسلہ آج تک نہیں رکا۔ آج میں اس پیر کو ڈھونڈ رہا ہوں کہ میرا بولنا بند ہو۔" وہ ہی کیا ہم
بھی اس پیر کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ شیخ صاحب کی ناک بھی ایسی ہے کہ اتنی دکھائی نہیں دیتی'
جتنی سنائی دیتی ہے۔ وہ کاغذی مقرر نہیں' اصلی مقرر ہیں۔ کاغذی مقرر وہ ہوتا ہے جس کے
پاس جب کاغذ ختم ہو جاتے ہیں' تو پتہ چل جاتا ہے کہ اس کی تقریر ختم ہو گئی ہے اور اصلی
مقرر وہ ہوتے ہیں جن کے بارے میں وہ خود یا خدا ہی جانتا ہے وہ کب بات ختم کریں گے۔
ہو سکتا ہے شیخ صاحب کتوں کے ووٹ بنوانے کی کوشش کریں لیکن ڈر ہے مصطفیٰ کھر اور شیخ
صاحب ان کی نمائندگی سے محروم رہ جائیں گے کیونکہ سیاست بڑا کتا کام ہے۔ اس میں تو
لوگ یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے کہ کوئی کیوں بھونک رہا ہے۔ بس وہ اسے کتے کا نام
دے دیتے ہیں۔

بیمارستان

جب ڈاکٹر موجودہ حکومت کے خلاف احتجاج کرتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے
کیونکہ جتنا اس حکومت نے ڈاکٹروں کی بھلائی کا اہتمام کیا ہے اور کسی حکومت نے نہ کیا ہو گا۔
سڑکیں ہی دیکھ لیں تو لگتا ہے عوام کی بھلائی کے لیے نہیں بنائی گئیں بلکہ آرتھوپیڈک
ڈاکٹروں کے لیے ہیں۔ پاکستان سیاست دانوں' مجرموں اور ڈاکٹروں کی جنت ہے۔ ڈاکٹروں
کے نزدیک انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک جو بیمار ہوتے ہیں۔ اور دوسرے وہ جنھوں نے

بیمار ہونا ہوتا ہے۔ نیا ڈاکٹر وہ ہوتا ہے جس کے پاس کوئی پرانا مریض نہیں آتا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹروں کے پاس آنے والے مریضوں کا پہلے تعلق غریب طبقے سے نہیں ہوتا۔ سپیشلسٹ ڈاکٹر وہ نہیں ہوتا جو ایک مرض کا علاج کرتا ہے' بلکہ وہ ہوتا ہے جو ایک مریض کا علاج کرتا ہے۔ جب ڈاکٹروں کی تعداد بڑھے تو مریضوں کی تعداد بڑھنے لگتی ہے۔ سائنس نے بڑی ترقی کی لیکن اتنی دوائیاں دریافت نہیں کیں جتنی بیماریاں کی ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ جدید تحقیق کے مطابق بے روزگار رہنا بھی ایک بیماری ہے اور ایک دن بے روزگار رہنا دس پیکٹ سگریٹ پینے کے برابر ہے۔ یعنی دونوں صورتوں میں جسمانی اور ذہنی بیماریاں ایک سی ہوتی ہیں۔ یوں اس خبر سے پتہ چلا کہ ملک میں جو 17 لاکھ 80 ہزار بے روزگار ہیں' وہ سب ڈاکٹروں کا روزگار ہیں۔

پاکستان وہ ملک ہے جہاں ملازمتوں پر اکثر پابندی ہوتی ہے۔ ورنہ حکومت کے لیے کسی کو روزگار دینا کون سا مشکل ہے۔ اسے وزیر بنا سکتی ہے۔ سابقہ حکومت میں ایک ورکر نے کہا کہ مجھے نوکری دیں۔ صاحب اقتدار بولے: "کوئی جاب خالی نہیں۔ جب کوئی سیٹ نکلے گی سب سے پہلے تمہیں نوکری ملے گی۔" کارکن نے ضد کی کہ آپ نے تو کہا تھا کہ حکومت میں آکر ہر صورت نوکری دلواؤں گا۔ تو صاحب اقتدار نے کہا: "اچھا میں ابھی ایک کمیٹی تشکیل دیتا ہوں جو یہ پتہ کرے کہ نوکریاں کم کیوں ہیں اور تم اس کمیٹی کے چیئرمین بن جاؤ۔" یار رہے بے روزگار اسے نہیں کہتے جو کچھ نہیں کرتا کیونکہ اگر کچھ نہ کرنے والوں کی فہرست بنائی جائے تو ہر دس میں سے سات سرکاری ملازم ہوں گے۔ بے روزگار رہنا آسان نہیں۔ اس میں کام کرنے سے کہیں زیادہ توانائی خرچ ہوتی ہے۔ تاہم اس تحقیق سے یہ پتہ چلا کہ بے روزگار ہونا بے کار نہیں' روزانہ سگریٹ کی کئی ڈبیوں کا خرچہ بچتا ہے۔ سگریٹ کے بارے میں ہماری بھی یہی رائے ہے کہ اس کے ایک سرے پر شعلہ اور دوسرے پر ایک بے وقوف ہوتا ہے۔ ایک دانشور نے بتایا کہ ایک دن میرا بیٹا کہنے لگا: "ابو آپ ہر روز درجنوں مرتبہ کاغذ کے ٹکڑوں کو آگ لگا کر منہ میں کیوں ڈال لیتے ہیں؟" آسکر وائلڈ کی ایک کردار لیڈی بریکنیکل کہتی ہے: "جب کوئی مرد مجھے کہتا ہے کہ وہ سگریٹ پیتا ہے تو یہ جان کر مجھے خوشی ہوتی ہے کیونکہ مردوں کا کوئی نہ کوئی پیشہ ہونا چاہیے اور لندن میں تو پہلے ہی بہت بے روزگار

ہیں۔" اعداد و شمار کے مطابق ہمارے ہاں روزانہ 1000 مرد سگریٹ نوشی ترک کرتے ہیں۔ ان میں سے 999 وہ ہوتے ہیں جو ایک روز قبل بھی یہ کچھ کر چکے ہوتے ہیں۔ ہمارے ایک عزیز نے اپنے پندرہ سالہ لڑکے سے کہا: "بیٹا وعدہ کرو۔ جب تم سگریٹ شروع کرو گے تو خود ہی مجھے بتا دو گے۔" تو وہ بولا: "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں نے کل سے سگریٹ نوشی ترک کر دی ہے۔" لیکن نئی تحقیق کے مطابق تو بے روزگاروں کی سگریٹ نوشی ختم کرانے کی ایک ہی صورت ہے کہ انہیں روزگار ملے۔ بے روزگاری عمر بھی کم کرتی ہے۔ ویسے اگر آپ لمبی عمر چاہتے ہیں تو وہ کچھ کرنا بند کر دیں جو آپ کرنا چاہتے ہیں اور وہ کچھ کریں جو آپ نہیں کرنا چاہتے۔ کہتے ہیں وہ پیشہ جس میں سب سے زیادہ جان کا خطرہ ہوتا ہے' وہ بے روزگاری ہے۔ اگرچہ اس بات کی ہمیں سمجھ نہیں آئی۔ جس بات کی ہمیں سمجھ نہیں آتی' وہ یقیناً کوئی سمجھ والی بات ہی ہو گی۔ ہم باکسنگ کو دنیا کا سب سے وحشیانہ کھیل سمجھتے ہیں۔ ایک تحقیق نے اعداد و شمار کی روشنی میں ثابت کیا کہ دنیا کا سب سے وحشیانہ کھیل تاش ہے۔ آج تک جتنے لوگ اس میں زخمی ہوئے ہیں' اتنے باکسنگ میں نہیں ہوئے۔

سگریٹوں کے بارے میں ہماری رائے ایسی ہی ہے جیسی لوگوں کی ہمارے بارے میں۔ بے نظیر بھٹو نے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا چالیس سال تک بندہ گوشت کھاتا ہے اور چالیس سال کے بعد گوشت بندے کو کھاتا ہے۔ ایسے ہم سمجھتے ہیں پہلی ڈبی سگریٹ بندہ پیتا ہے اور اس کے بعد سگریٹ بندے کو پیتا ہے۔ سگریٹ نوشی کئی بیماریوں کا باعث ہے جن میں جگر' دل اور دماغ کی نمایاں ہیں' لیکن سگریٹ نوشی بڑھاپے کا علاج بھی ہے جبکہ ہمارے ہاں ہر کسی کی خواہش ہوتی ہے کہ بڑھاپا بہت طویل ہو۔

ہمارے ہاں بے روزگار ہونا اتنا بھی آسان نہیں' اس کے لیے پہلے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے۔ اگرچہ ملک سے بیروزگاری کم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کو چند سالوں کے لیے بند کر دیا جائے۔ اس وقت پاکستان میں 17 لاکھ 80 ہزار سے زائد بے روزگار ہیں' لیکن اس کے باوجود کہا جاتا ہے کہ ہر پاکستانی کی اوسط آمدنی میں اضافہ ہوا ہے۔ ویسے جہاں تک لفظ اوسط کا تعلق ہے' یہ بڑا اوسط درجے کا لفظ ہے۔ مشہور ماہر معاشیات والٹر ہیلر کہتا ہے کہ جب کوئی ماہر شماریات اوسط کا لفظ استعمال کرتا ہے تو اس کی

مثال ایسے ہی ہے جیسے ایک آدمی کا ایک پیر جلتے ہوئے چولہے میں اور دوسرا پیر فریج میں رکھ دیا جائے تو اس پر ماہر شماریات یہ بتائے کہ اوسط کے اعتبار سے یہ شخص انتہائی پر سکون ہے۔ سو اوسط کے لحاظ سے تو ہر پاکستانی پر سکون ہے۔ غصے اور بے روزگاری میں بندہ اپنی انرجی اپنے ہی خلاف استعمال کرتا ہے۔ بے روزگاری میں مبتلا مریضوں کے علاج کے لیے ابھی تک کوئی موثر دوا مارکیٹ میں نہیں آئی۔ ہم سمجھتے ہیں بے روزگاروں کا علاج اب حکومت کے پاس نہیں، ڈاکٹروں کے پاس ہی ہے۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے حکومت بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ڈاکٹروں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے ہی کر رہی ہو۔

ملکہ غزل

جب سے ہمیں یہ پتہ چلا ہے کہ ملکہ ترنم نور جہاں نے باقاعدہ شاعری شروع کر دی ہے۔ ان کی غزلوں کی کتاب عنقریب چھپ کر "بازار" میں آ رہی ہے، تب سے ہم سوچ رہے ہیں کہ یہ اطلاع ہے یا دھمکی۔ ملکہ ترنم ہمیں تب سے پسند ہیں جب ہم ابھی اردو کی پہلی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان دنوں والد محترم ہمیں لاہور لائے اور مقبرہ جہانگیر کی سیر کروائی۔ واپسی پر وہ ہمیں مقبرہ نور جہاں لے گئے تو ہم زار و قطار رونے لگے۔ والد صاحب نے پوچھا

”تمہیں نور جہاں کی کیا بات پسند تھی؟“ ہم نے روتے ہوئے کہا: ”اس کے گانے۔“ پھر جب ہم بڑے ہوئے اور ہم نے ”اردو کی آخری کتاب“ پڑھی تو ہمیں پتہ چلا اس سے قبل ایک ملکہ غیر ترنم نور جہاں ہوا کرتی تھیں۔ بقول ابن انشاء ”جن لوگوں نے سہراب مووی کی فلم ”پکار“ دیکھی ہے‘ اس کے لیے جہانگیر کی ذات اور کارنامے محتاج تعارف نہ ہوں گے۔ اس کی بیوی نور جہاں تھی جو ملکہ ترنم تو نہ تھی لیکن بعض اور کمالات رکھتی تھی۔ ابھی نوعمر ہی تھی اور لوگوں کے کبوتر پکڑ کر اڑا دیا کرتی تھی۔ خصوصاً شہزادوں کے۔ بعد میں ایسی زوردار ملکہ ثابت ہوئی کہ بڑے بڑوں کے ہاتھوں کے طوطے اسے دیکھتے ہی اڑ جایا کرتے تھے۔“

جب سے ہمیں پتہ چلا کہ فلم انڈسٹری کی ملکہ نور جہاں نے شاعری شروع کر دی ہے‘ طوطے تو ہمارے ہاتھوں کے بھی اڑ گئے ہیں۔ شاعری اور گلوکاری کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جس میں چولی گلوکارہ کی اور دامن شاعری کا ہوتا ہے۔ شاعروں میں بیشتر شرکاء کو سن کر لگتا ہے انہیں گلوکار ہونا چاہیے تھا۔ ہمارے ایک شاعر دوست کہتے ہیں‘ شاعری کے لیے بڑا ریاض چاہیے۔ پچھلے ہفتے ملے اور کہنے لگے: ”میں نے مشہور شاعر بننے کے لیے گلوکاری شروع کی تھی مگر محلے والے اس قدر ڈسٹرب کرتے ہیں کہ صبح تین بجے ہی اٹھ کر میرا دروازہ‘ دیواریں یہاں تک کی چھت بھی اس زور سے کھٹکھٹاتے ہیں کہ میں صبح جو ریاض کر رہا ہوتا ہوں‘ مجھے اس کی آواز سنائی نہیں دیتی۔“ جرمن کہتے ہیں‘ ادب کے وہ ناقد جو لکھ نہیں سکتے‘ وہ اتنے خطرناک نہیں ہوتے جتنے وہ ناقد جو پڑھ نہیں سکتے۔ ایسے ہی نقادوں کی رائے ہے کہ حبیب جالب‘ مظفر وارثی اور صبا اختر شاعر کم گویئے زیادہ تھے۔ سو گلوکاروں کے لیے شاعری میں بڑا اسکوپ ہے۔ اور اگر وہ گلوکارہ ہو تو پھر کیا ہی کہنے۔ میڈم نور جہاں تو ایک زمانے میں دیکھنے میں خود غزل لگتیں۔ اگرچہ آج کل وہ دیوان لگنے لگی ہیں۔ شاعری کے حوالے سے میڈم کا نام پہلے ہی بہت ہے۔ ایک بار تو ایک صاحب نے فیض احمد فیض سے کہہ دیا تھا کہ وہ نور جہاں والی غزل سنائیں۔ غزل عورتوں سے باتیں کرنے کو کہتے ہیں‘ لیکن میڈم جس عمر کی ہیں اس عمر کی عورتوں سے باتیں کرنا نظم ہی ہو سکتا ہے۔ اس عمر میں تو دل لگانا بھی دل کی ورزش کرنے کے زمرے میں آتا ہے۔ پھر پتہ نہیں میڈم نظم کی طرف کیوں نہیں آئیں‘ جیسے عطاء الحق قاسمی لکھتے ہیں ان کے ایک شاعر دوست جو زمانہ طالب علمی میں ایک

جماعت سے وابستہ تھے‘ ایک بار کسی خاتون کے ساتھ سینما دیکھنے گئے۔ رپورٹ پر ہائی کمان کے سامنے پیشی ہوئی تو انہوں نے کہا: ”میری عزیزہ دوسرے شہر سے آئی تھی‘ فلم دکھانے لے گیا۔“ یہ سن کر کہا گیا: ”یہ تو ٹھیک ہے مگر جماعت کا نظم بھی کوئی چیز ہے۔“ اس پر وہ صاحب بولے: ”نظم اپنی جگہ پر غزل بھی آخر کوئی چیز ہے۔“

خواجہ پرویز نے میڈم کی شاعری کی اصلاح کی ہے‘ جس سے خواجہ صاحب کی شاعری مزید رومانی ہو گئی ہے۔ صاحب مرد کو شاعری کرنے کے لیے ایک عورت چاہیے اور خواتین کو شاعری کے لیے ایک بندہ۔ رائٹرز خوابوں کے محل بناتے ہیں۔ قارئین ان میں رہتے ہیں اور پبلشرز ان کا کرایہ وصول کرتے ہیں۔ میڈم کی شاعری کی کتاب ہی نہیں‘ وہ تو جس ادبی تقریب میں شرکت کریں گی‘ اس کی ٹکٹیں بکنے لگیں گی۔ یوں ادبی حلقوں میں رونق ہو جائے گی۔ ہم یہ تو نہیں کہتے‘ پہلے ادبی حلقوں میں الو بولتے ہیں کیونکہ ایک بار ہم نے کہہ دیا کہ ادیبوں کے نہ آنے کی وجہ سے حلقہ ارباب ذوق میں الو بول رہے تھے۔ تب سے کئی نقاد ہم سے ناراض ہیں۔ میڈم بڑی حساس خاتون ہیں۔ جوانی میں تو وہ ذرا سی بات پر خاوند سے کئی دن ناراض رہتیں جس پر منٹو صاحب نے کہا: ”واقعی یہ دن کو ہی ناراض رہ سکتی ہیں۔“ بے وقوف کا دل اس کے منہ میں ہوتا ہے اور عقل مند کا منہ اس کے دل میں۔ میڈم بھی دل سے گاتی ہیں۔ اب وہ دل لگا کر شاعری کریں گی لیکن اس شاعری کی ہی شہرت اور عزت میں اضافہ ہوگا۔ میڈم کو تو اس کا اتنا ہی فائدہ ہوگا‘ جتنا اس نوجوان کو ہوا تھا جس نے یونین کے نمائندے کو چندے کی رقم دی اور ایک مقامی کلب کا شریک رکن چن لیا گیا تو اس نے پوچھا: ”اب جب کہ میں رکن بن گیا ہوں‘ مجھے کیا حقوق حاصل ہوئے ہیں؟“ نمائندے نے کچھ دیر سوچ کر کہا: ”میرے خیال میں آپ کو آئندہ سال پھر چندہ دینے کا حق حاصل ہو گیا ہے۔“

HOLYDAYS INN

کشور ناہید، رعنا شیخ اور بشریٰ رحمٰن کو دیکھ کر تو ہمارے ذہن میں یہی خیال آتا ہے کہ مردوں کو بھی عورتوں کے برابر حقوق ملنے چاہئیں۔ اگرچہ عورت ہونا ایک کیفیت ہے جو کبھی مرد پر بھی آسکتی ہے۔ سائنس کہتی ہے ماں کے پیٹ میں ہر بچہ پہلے لڑکی ہوتا ہے۔ یعنی قدرت جب کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہوتی ہے، تو اسے عورت ہی رہنے دیتی ہے۔ عورت ویسے بھی خدا نے دوسری Attempt میں بنائی۔ بیوی ہونا تو بڑا ہی مشکل ہے، خاص کر کے

خاوندوں کے لیے۔ شاید اسی لیے بھارتی پارلیمنٹ میں ایک کانگریسی رکن نے نجی حیثیت سے یہ مسودہ قانون ایوان میں پیش کیا ہے، جس کے تحت گھر چلانے والی بیویوں کو چھ دن کی مشقت کے بعد ایک دن کی چھٹی کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ گھر چلانے والی عورتوں کی اس چھٹی کی تجویز کو گھر چلانے والی عورتوں نے بہت سراہا ہے۔ سچی بات ہے گھروں میں خواتین کو جتنا کام کرنا پڑتا ہے، اس کا صحیح اندازہ لگانے کے لیے عورت ہونا ضروری ہے جو فی الحال ہمارے لیے ممکن نہیں۔ تاہم اتنا علم ہے کہ گھر میں ایک عام عورت صبح سے لے کر شام تک برتن دھونے والی، دھوبن، جمعدارنی، باورچن، استری کرنے والی، ٹیلیفون اٹینڈنٹ، نرس، ملازمہ، پرسنل سیکرٹری، دایہ، جوتے پالش کرنے والی اور نہ جانے کیا کیا ہوتی ہے۔ ایم اے کرنے کے بعد ایک شاعرہ کو نوکری نہ ملی تو اس نے شادی کرلی جس پر اس کی ایک سہیلی بولی:

"تمہیں آٹھ گھنٹوں کی ملازمت ہی کرنا چاہیے تھی۔"

دنیا میں دو قسم کے ملازم ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو سر اٹھا کر کلاک کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں: "ابھی تین ہی بجے ہیں۔" اور دوسرے وہ جو اس صورت حال میں کہتے ہیں "تین بج بھی گئے۔" ملازموں کی ایک تیسری قسم بھی ہے جسے خاتون کہتے ہیں۔ ایک ملازمت کے انٹرویو میں ایک خاتون سے پوچھا گیا: "آپ اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟" وہ محترمہ بولی: "میں اتنی ذہین اور سمجھ دار ہوں کہ پزل اور معمے حل کر کے اکثر انعام جیتتی رہتی ہوں۔" انٹرویو کرنے والے نے کہا: "لیکن ہمیں تو وہ چاہیے جو اپنی ذہانت دفتر میں دوران کام استعمال کر سکے۔" تو وہ بولی: "میں نے یہ معمے دفتر ہی میں تو حل کیے تھے۔" ساری خواتین ایسی بھی نہیں ہوتیں۔ ہم ایک ایسی خاتون کو جانتے ہیں جو ایک ہفتے میں دو ہفتوں کا کام کرلیتی ہے۔ اسی لیے اس کے باس نے دو ہفتوں کی بجائے اسے ایک ہفتے کی چھٹی دی کہ تم اتنی تیز ہو کہ تم ایک ہفتے میں اتنا انجوائے کر سکتی ہو، جتنا عام عورت دو ہفتوں میں کرتی ہے۔ اگرچہ بھارتی پارلیمنٹ میں پیش کیے گئے مسودے سے لگتا ہے، بیوی گھر میں ملازم ہے جسے ہفتہ وار چھٹی ملنا چاہیے۔ حالانکہ اگر یہ مطالبہ خاوندوں کی طرف سے ہوتا کہ انہیں گھر سے ہفتے میں ایک چھٹی ملنا چاہیے تو بات سمجھ میں آتی تھی، لیکن چونکہ مسودے میں چھٹی کا ذکر ہے اور چھٹی ہمیں اس قدر پسند ہے کہ ہمارے ہاں آدھے سال سے زیادہ سرکاری ملازمین کی

چھٹیاں ہوتی ہیں۔ 1996ء میں جمعہ ہفتہ کی 96' سرکاری 20' اتفاقیہ 25' استحقاقی 48 اور اختیاری 21 چھٹیاں تھیں۔ اس حساب سے تو پاکستان Holidays Inn ہے۔ ہمارے ہاں تو انصاف کی وجہ سے انگریز جج گرمیوں میں پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ اب پتہ نہیں کیوں گرمیوں میں انصاف پہاڑ پر چڑھ جاتا ہے۔ محکمہ تعلیم کا تو یہ حال ہے کہ ہمارے ایک رائٹر نے بتایا کہ میں چار نوکریاں کرتا ہوں۔ صبح سے سہ پہر تک ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتا ہوں۔ شام کو ٹیوشن سنٹر اور رات کو ایک اخبار میں جاب ہے۔ عرض کیا: "چوتھی جاب کے لیے وقت کیسے نکالتے ہیں؟" بولے: "آپ کو پتہ تو ہے کہ میں کالج میں پروفیسر ہوں۔" ہم گھریلو خواتین کی ہفتے وار چھٹی کے حق میں تو ہیں' لیکن ہمیں یہ سمجھ نہیں آتی کہ بھارتی پارلیمینٹ میں آخر یہ مسودہ ایک مرد نے کیوں پیش کیا۔ مرد تو شام کو گھر بلاوجہ پھول لائے تو اس کی بھی کوئی وجہ ہوگی۔ خاوند اور سیاست دان جتنا کامیاب ہوتا ہے' اتنا ہی وہ جھوٹا ہوتا ہے۔ سو اگر یہ مطالبہ کسی مرد کا ہے تو پھر اس میں فائدہ بھی مرد کا ہی ہوگا۔ ہم سمجھتے ہیں گھر کی حکمران عورت ہوتی ہے۔ جہاں اکلوتا عوام خاوند ہے۔ خاتون سے یہ مطالبہ کہ وہ ہفتے میں ایک دن چھٹی کیا کرے ایسے ہی ہے جیسے بے نظیر بھٹو صاحبہ سے کہنا کہ آپ ہفتے میں سات دن وزیراعظم ہوتی ہیں' آپ پر بہت بوجھ ہے۔ آپ ہفتے میں ایک دن وزیراعظم کی جاب سے چھٹی کر لیا کریں۔ اپوزیشن کو تو محترمہ کے آرام کا اس قدر خیال ہے کہ وہ تو کہتی ہے' محترمہ ہفتے میں سات دن چھٹی کیا کریں۔ حالانکہ ہم سمجھتے ہیں موجودہ حکومت کے بڑے فائدے ہیں۔ ہم نے ایک میاں بیوی سے پوچھا: "لڑتے ہو تو الزام ایک دوسرے پر لگاتے ہو؟" جواب ملا: "نہیں۔ کبھی بچوں پر اور کبھی حکومت پر۔"

صاحب! زمانہ زنانہ لباس کی طرح بدل رہا ہے۔ پہلے چار یا چار سے زیادہ مرد اکٹھے ہوتے تو وہ سیاست اور کھیلوں کے بارے میں باتیں کرتے اور جہاں چار یا چار سے زیادہ عورتیں اکٹھی ہوتیں تو وہ مردوں کے بارے میں باتیں کرتیں۔ اب ہمارے ہاں عورتیں کھیلوں اور سیاست کی باتیں کرتی ہیں اور مرد عورتوں کی۔ پچھلے دنوں ایک محترمہ کا اخبار میں خط چھپا۔ اس نے پاکستان کی محترمہ سے درخواست کی تھی کہ ہمارے ہاں فوج میں عورت کو صرف ڈاکٹر یا نرس کے روپ میں جاب ملتی ہے جبکہ میں لڑاکا فورس میں بھرتی

ونا چاہتی ہوں۔ اگر کنواری لڑکیوں کو بھرتی کرنے میں کوئی قباحت ہے تو شادی شدہ نواتین کو تو موقع دینا چاہیے تاکہ ان کا تجربہ اور صلاحیتیں ملک و قوم کے کام آسکیں۔ ویسے ہمیں امید ہے کہ مرد خوش ہو کر خود ہی عورتوں کو ایک دن کی چھٹی دے دیں گے۔ ہو سکتا ہے خاوند خوش ہو کر انہیں مزید چھٹی دینا چاہیں' لیکن سچی بات یہ ہے گھر تو گھر' فتروں میں بھی عورتوں کی جگہ کوئی نہیں لے سکتا۔ مرد کا کام تو روبوٹ اور مشینیں کر سکتی ہیں لیکن ابھی تک کوئی ایسی مشین ایجاد نہیں ہوئی جو روز آدھا ڈبہ ٹشوز استعمال کرے' 9 مرتبہ واش روم جائے اور 16 پرسنل کالز کرے۔

و - زیرِ بیان

اخبار پڑھ کر ہمیں تو لگتا ہے ہر روز یہ ہی وزیرِ بیان ہے۔ ایک سیاست دان کی سانس اکھڑ رہی تھی۔ آکسیجن لگانے سے بھی بہتر نہ ہوئی تو اس کا پی اے ایک صحافی کو پکڑ لایا۔ سیاست دان موصوف نے بیان دیا تو ان کی سانس میں سانس آئی۔ ان کے بیان روکنے سے وہی نتیجہ نکلتا ہے جو سانس روکنے سے اور ہماری عرصہ سے خواہش ہے کہ ان کو خاموش دیکھیں۔ پہلے خاموشی عقل مندی کی دلیل ہوتی تھی، اب خاموشی عقل مندی کی

دلیل ہے۔ ایک بار ایک پریس فوٹوگرافر نے ہمیں خالد کھرل صاحب کی تصویر دکھاتے ہوئے کہا: "اس تصویر میں وہ بہت ہی خوبصورت لگ رہے ہیں۔" ہم نے پوچھا: "اس میں کیا خاص بات ہے۔" فوٹوگرافر بولا: "اس میں ان کا منہ بند ہے۔" برطانیہ میں ایک تصویری مقابلہ ہوا تھا جس میں نایاب ترین لمحوں کی تصویریں تھیں۔ ان میں جس تصویر کو حوصلہ افزائی کا انعام ملا، وہ اس فوٹوگرافر کی ساس کی تھی اور تصویر میں ساس چپ بیٹھی تھی۔ دنیا میں ساسوں کے بعد سب سے زیادہ سیاست دان بولتے ہیں۔ لیکن لگتا ہے ہمارے بچے کم کرنے کی وزارت کے وزیر جے سالک صاحب بچوں کی طرح بولنے کو اہم کام سمجھتے ہیں۔ اسی لیے انہوں نے فرمایا ہے میں نے قذافی سٹیڈیم میں مسلسل 16 گھنٹے تقریر کر کے ورلڈ ریکارڈ قائم کیا ہے۔ اس لیے میرا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل ہونا چاہیے۔ ہمارے خیال میں تو اس میں سننے والوں کا نام شامل ہونا چاہیے۔ اتنے گھنٹے تو بندہ طاہرہ سید کو سنے تو نعیم بخاری لگنے لگتا ہے۔ ہاں اگر وہ کہتے کہ مسلسل 16 گھنٹے اس علاقے کے لوگوں کو تقریر میں مصروف رکھ کر میں نے بہبود آبادی کا یہ کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ اس علاقے میں بچوں کی شرح پیدائش ایک فیصد کم کر دی ہے تو بات ماننے والی تھی۔

ہم جے سالک صاحب کو ذاتی طور پر نہیں جانتے، لیکن ہم نے نور جہاں، عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی، بے نظیر، ریشماں، حسین بخش گلو، نواز شریف اور جے سالک کو بہت سنا ہے۔ جے سالک پہلے ہاتھ چھوڑ کر سائیکل چلایا کرتے تھے۔ آج کل ایسے ہی وزارت چلاتے ہیں۔ ہماری جس بارے میں اچھی رائے ہو، اسے ذاتی طور پر جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب گیمبیا آزاد ہوا تو اس کے وزیراعظم پیشے کے اعتبار سے جانوروں کے ڈاکٹر تھے۔ بی بی سی کے نمائندے نے انٹرویو لیتے ہوئے ان سے پوچھا: "آپ کا پیشہ" تو وہ بولے: "میرے ملک کی کسی گائے سے پوچھ لو۔ وہ مجھے ذاتی طور پر جانتی ہے۔" ہم ذہنی امراض کے ڈاکٹر ہیں۔ سیاست دانوں سے اس لیے نہیں ملتے کہ لوگ سمجھتے ہیں، ہمارا ان سے پیشہ وارانہ تعلق ہے۔ یہ تعلق بڑا مشکوک ہوتا ہے۔ ہمارے ایک ڈاکٹر صاحب کی فلمی ڈانسر سے ملاقاتوں کی خبر اس کی بیوی تک پہنچی تو اس نے پوچھا: "تم اس

حرافہ کو کس سلسلے میں ملتے ہو؟" ڈاکٹر نے کہا: "پیشے کے سلسلے سے۔" تو بیوی بولی: "کس کا پیشہ تمہارا یا اس کا۔" پچھلی چند دھائیوں اور دوہائیوں میں سیاست دانوں نے بڑی ترقی کی ہے۔ ایک سیاست دان کو ہم بھی جانتے ہیں' جنہوں نے میٹرک بھی کر لیا ہے۔ وہ ایک تقریر میں فرما رہے تھے: "انسان اور جانور میں بڑا فرق ہے۔ انسان نے پچھلے دس برسوں میں بڑی ترقی کی ہے' جبکہ جانوروں نے نہیں کی۔" ایک صحافی نے پوچھا: "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" تو وہ بولے: "گدھے کو دیکھ لیں۔ جیسا پہلے تھا ویسا ہی آج آپ کے سامنے ہے۔"

زبان میں سب کچھ ہو سکتا ہے' لیکن ہڈی نہیں۔ سیاست دان زبان سے سوچتا ہے۔ اس کا منہ اس کے دماغ سے تیز چلتا ہے۔ کہتے ہیں برصغیر پر انگریز نے اتنے سال اپنی زبان کے زور پر حکومت کی۔ تاریخ گواہ ہے' وہی قوم دوسری پر حاوی ہوئی جس کی زبان دوسری قوم کی زبان پر حاوی ہوگئی۔ سیاست دان ہم پر زبان کے زور پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ سولہ سولہ گھنٹے بولتے ہیں اور ایک بات بھی نہیں کہتے۔ اسمبلی میں ان کی گفتگو کو خود کلامی کہتے ہیں۔ وہ مفت بولتے ہیں مگر چپ ہونے کے پیسے لیتے ہیں۔ ان کی یادداشت اتنی کمزور ہوتی ہے کہ ایک سیاست دان نے کہا: "مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ بچپن میں جب میں اپنے چار منزلہ مکان کی چھت سے گرا تھا' تو زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ ایران میں اطلاعات و نشریات کے وزیر کو وزیر ارشاد کہتے ہیں۔ یہاں تو ہر وزیر ہی وزیر ارشاد ہے۔ جتنے ان کے منہ سے روزانہ الفاظ نکلتے ہیں' اتنے گندم کے دانے نکلتے تو پاکستان میں کوئی بھوکا نہ سوتا۔

جے سالک صاحب کہتے ہیں: "کام کرنے کے تین طریقے ہیں۔ ایک صحیح طریقہ دوسرا غلط طریقہ اور تیسرا میرا طریقہ۔" وہ بڑے طریقے سے ریکارڈ بناتے رہتے ہیں۔ وہ بچے کنٹرول کرنا چاہتے ہیں حالانکہ وہ بڑوں کو کنٹرول کر لیں تو بچے ہوں ہی نا۔ محکمہ بہبود آبادی اب محکمہ بے بہابود آبادی بن گیا ہے۔ محکمہ بہبود آبادی کا ایک افسر بتا رہا تھا: "وہ مصری جنہوں نے احتیاطی تدابیر نہ کیں "ممی" بن گئے۔" ہمارے ہاں یہ کچھ کرنے والے ڈیڈی بنتے ہیں۔ ہمارے ہاں بچے بہت ہوتے ہیں اور مغرب والے

والدین۔ ہالی وڈ میں اس بچے کو کمتر خیال کیا جاتا ہے جو جب گرائمر سکول سے گریجویشن کر کے نکلے تو اس کے والدین وہی ہوں جنہوں نے اسے کنڈرگارٹن میں داخل کروایا تھا۔ سالک صاحب کا محکمہ تو ناامیدی پھیلانے کے لیے ہے کیونکہ اس کا مقصد ہے کوئی امید سے نہ ہو۔ اس کے باوجود ہمیں جے سالک صاحب سے بڑی امید ہے۔ جہاں تک ورلڈ ریکارڈ بنانے کا تعلق ہے تو انہیں چاہیے' 16 گھنٹے خاموش رہنے کا ریکارڈ بنائیں کیونکہ سولہ گھنٹے کی مسلسل تقریر کا کوئی نوٹس نہ لے گا۔ اگر کسی نے نوٹس لیا ہوتا تو یہ سولہ گھنٹے کی ہوتی ہی کیوں۔

حوّاشماری

کسی مغربی ملک کے ایئرپورٹ پر اترتے ہی بندے کو لگتا ہے جیسے یہاں کے تمام مرد ہڑتال پر ہیں۔ اردو کے سفرنامہ نگاروں کے سفرنامے پڑھ کر تو لگتا ہے کہ وہاں کے شہر بھی مردوں سے خالی ہی ہوتے ہیں۔ اسی لیے ہر طرف عورتیں ہی عورتیں نظر آتی ہیں۔ ہم نے تاشقند ایئرپورٹ پر ایک محترمہ سے پوچھا تھا: "آپ کے مرد کہاں ملتے ہیں؟" تو وہ بولی: "واڈکا کی خالی بوتل کے پاس۔" اس کے برعکس پاکستان کے کسی ایئرپورٹ پر اترتے ہوئے

سب سے پہلے یہی احساس ہوتا ہے کہ اس ملک میں خواتین کم ہی رہتی ہیں۔ آج کے اخبارات میں چھپنے والے اعداد و شمار نے اس خدشے کو یقین میں بدل دیا ہے۔ کہتے ہیں جھوٹ دو قسم کے ہوتے ہیں ایک سفید جھوٹ اور دوسرے اعداد و شمار۔ بجٹ کے بعد سے ہم اعداد و شمار سے یوں ڈرتے ہیں جیسے سانپ کاڈساری ہے۔ آج کے اخباری اعداد و شمار نے ہمارے علاوہ مولویانہ حلقوں میں بھی تشویش کی لہر دوڑا دی ہے۔ جس کے مطابق پاکستان میں عورتوں کی تعداد اس قدر کم ہوگئی ہے کہ ہر دس مردوں میں سے ایک عورت نہ ملنے کی وجہ سے کنوارہ رہ جائے گا۔ جس پر ایک مولوی صاحب نے پریشان ہوتے ہوئے کہا: "گویا اب ایک ہی شادی پر شاد ہونا پڑے گا یا پھر مولانا فضل الرحمٰن کی طرح اس نیک کام کے لیے کسی اور ملک سے رجوع کرنا پڑے گا۔"

پاکستان میں تو آبادی کی گنتی کرنا مردم شماری کہلاتا ہے۔ سو ہمیں اس حواشماری سے خوشی ہوئی کہ عورتیں بھی کسی گنتی میں آئیں۔ کچھ ملکوں میں ابھی بھی عورتوں کو گنا نہیں' تولا جاتا ہے۔ نائجیریا کے کچھ علاقے میں شادی سے پہلے عورت کا وزن کر کے دیکھتے ہیں۔ جس کا وزن جتنا زیادہ ہو' اسے بیوی بنانے کیلئے اتنے زیادہ ہی پیسے دینے پڑتے ہیں' جس کی وجہ ہمارے دانشور دوست یہ بتاتے ہیں کہ نائجیریا غیر ترقی یافتہ ملک ہے۔ شاید ہماری حکومت نے پاکستان کو ترقی یافتہ بنانے کے لیے ہی عورتوں کو گننا شروع کیا ہو۔ ممتاز افسانہ نگار انتظار حسین لکھتے ہیں گنتی انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ انسان اس دن مہذب ہوا جس روز اس نے گنتی سیکھی۔ شاید اسی لیے بچے کو سب سے پہلے گنتی سکھاتے ہیں۔ گنتی کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگائیں کہ ہمارے صوبائی وزیر تعلیم کے میٹرک میں نمبر کم آئے تو اس نے کہا: "گنتی دوبارہ کراؤ۔ دھاندلی ہوئی ہے۔" ہو سکتا ہے عورتیں کہیں کہ ہم اتنی بھی کم نہیں ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی دھاندلی ہوئی ہے۔ حواشماری دوبارہ ہونی چاہیے۔ موجودہ حکومت نے عورتوں کی گنتی بڑھانے کے لیے پیشگی اقدامات کے طور پر ان کے ووٹ دو کر دیئے ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں ایک بیوی کو بھی دو ہی سمجھا جاتا ہے۔ سابق گورنر میاں اظہر صاحب سے ایک بار ہم نے پوچھا: "بندہ سب سے بہادر کہاں ہوتا ہے' گھر سے باہر یا گھر میں؟" تو وہ بولے: "گھر میں' خاص کر کے اس وقت جب گھر والی باہر ہو۔" شادی سے پہلے

بیوی کی آنکھیں کبھی ہرنی جیسی لگتی ہیں تو کبھی مچھلی کی طرح‘لیکن شادی کے بعد یہ طوطے جیسی لگنے لگتی ہیں۔ شادی کے بعد وہ کان سے کم اور آنکھ سے زیادہ سنتی ہے۔ عربوں میں غریب اسے کہتے ہیں جس کے پاس ایک ہی بیوی ہو۔ پر مغرب میں پہلی بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری شادی کرنے پر سزا ملتی ہے۔ ہمارے ہاں بھی دوسری شادی پر سزا ہے اور وہ ہے دوسری ساس۔ بیوی تو ایک بھی بہت ہوتی ہے پر کیا کریں ایک سے کم بیوی ہو نہیں سکتی۔ کہتے ہیں دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ ہمارے ایک شاعر دوست اپنی بیوی کی قبر پر دبے پاؤں جاتے ہیں کہ کہیں کھٹکے سے وہ اٹھ نہ پڑے۔ اسی لیے انہوں نے بیوی کی قبر پہلی فرصت میں ہی پکی کرا دی تھی‘ کہتے ہیں قبریں پکی کرنا اس دن شروع ہوا جس روز ایک بندے کی بیوی قبر سے نکل کر زندہ ہو گئی۔ ہمارے ہاں کچھ لوگ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں۔ شاید اسی لیے ساتھ لے کر مسجد نہیں جاتے۔ خاوند اچھا نہ ہو تو بیوی کے پاس خوش رہنے کے سو حیلے ہیں۔ اکیلی بیٹھی ان بندوں کی فہرست بنائے جن سے اس کی شادی ہو سکتی تھی۔ اور پھر اس پر خوش ہو کہ نہیں ہوئی۔ اسی لیے تو لاس اینجلس کی رنگ و روغن کی دکان پر یہ بورڈ لگانا پڑتا ہے کہ جو خاوند خود رنگ پسند کرنا چاہتے ہیں‘ ان کے پاس ان کی بیوی کی تحریری اجازت نامہ ہونا ضروری ہے۔ جنوبی مراکو کی عورتیں اس لیے پاؤں سے کپڑے دھوتی ہیں کہ ہاتھوں سے دھونے کے لیے جھکنا پڑتا ہے۔ اور وہاں بیوی جھک جائے تو لوگ اسے خاوند کہنے لگتے ہیں۔ پاکستان ان ممالک میں سے ہے جہاں گھر سے لے کر حکومت تک عورتوں کی حکمرانی ہے۔ یہاں خواتین کم ہیں تو کیا ہوا۔ خاتون ایک بھی ہو تو وہ کئی مردوں سے زیادہ نظر آتی ہے۔ معاشرے میں خواتین شاید اس لیے کم رہ گئی ہیں کہ زیادہ حکومت میں جو آ گئی ہیں۔

ا - دبی حکومت

ہماری ایک مشہور اداکارہ نے شادی سے اگلے روز ہی کہہ دیا تھا کہ خاوند حکومت ی طرح ہوتے ہیں۔ یہ وعدے بہت کرتے ہیں مگر کچھ کر کے نہیں دکھاتے۔ لیکن ہمیں کومت سے کوئی شکایت نہیں۔ اگرچہ آج کل جو حکومت سے شکایت نہیں کرتا‘ لوگ مجھتے ہیں یہ حکومت کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ ویسے بھی ہمارا حکومت سے اپنے ایک جاننے الے کی طرح کا معاہدہ ہے۔ موصوف کے پاس ایک شخص ادھار لینے آیا تو بولے: ”میرا

مچھلی پکوڑوں کا کام بینک کے ساتھ معاہدے کی وجہ سے چل رہا ہے۔" پوچھا: "کیسا معاہدہ؟" "یہ کہ بینک میرے والا کام نہیں کرے گا اور میں بینک والا کام نہیں کروں گا۔" ایسے ہی ہم حکومت کا کام نہیں کرتے' حکومت ہمارا کام نہیں کرتی۔ وزیراعظم نواز شریف بنے یا بے نظیر' ہم تو اسی پر خوش ہو جاتے ہیں کہ چلو ایک وقت میں ان میں سے صرف ایک ہی وزیراعظم ہے۔ ہم مانتے ہیں طاقت کا منبع عوام ہے مگر طاقت ان کی طرف لوٹ کر نہیں آتی۔ وہ عوام جن کا ناس مار دیا جائے' اسے عوام الناس کہتے ہیں۔ عوام الناس نے پاکستان کو ہڑتالیوں کا ملک بنا دیا ہے۔ ہفتے میں پانچ دن ہڑتال اور باقی دو دن چھٹی ہوتی ہے۔ البتہ حکومت کی چھٹی نہیں ہوتی۔ یہی حالات رہے تو ایک دن وزارت ہڑتال بنانا پڑے گی۔ وزیر ہڑتال کا کام بھی وزیر بہبود آبادی جیسا ہوگا۔ یعنی ایک بچے کنٹرول کرے گا اور دوسرا بڑے۔ ہم مانتے ہیں حق کی ہمیشہ فتح ہوتی ہے۔ کیونکہ جس کی بھی فتح ہوتی ہے وہ ہمیشہ حق پر ہی ہوتا ہے' لیکن کبھی کبھی ہڑتال کی وجہ ایسی ہوتی ہے کہ اس پر احتجاجاً ہڑتال کرنے کو دل چاہتا ہے۔ جیسے اردو بازار کے تاجروں کی ہڑتال اس لیے تھی کہ سیلز ٹیکس لگنے سے کتابوں کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی۔ اس سے پہلے تاجر اور پبلشر آسمان سے باتیں کرتے تھے۔ پبلشر میں تو پورا "شر" آتا ہے۔ تھامس کیمپسن نے ایک بار کہا تھا: "حضرات! میں مانتا ہوں' نپولین بڑا سنگ دل اور ظالم شخص تھا۔ اس نے میری برادری پر بڑے ظلم کیے' لیکن یہ مت بھولیں کہ اس نے ایک پبلشر کو گولی بھی ماری تھی۔" سچی بات ہے ہمیں تو یہ سن کر خوشی ہوئی کہ حکومت نے علم و ادب کی قدر و "قیمت" میں اضافہ کیا ہے۔ علم و ادب جتنا قیمتی بے نظیر حکومت میں ہوا' کسی حکومت میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ حکومت نے مہنگائی کی تو بہت کچھ سستا بھی کیا۔ جیسے ہر ہفتے وہ روپیہ سستا کر دیتی ہے تاکہ عوام یہ نہ سمجھیں کہ ہر چیز مہنگی ہی ہو رہی ہے۔ جب ہمیں پتہ چلا تھا کہ ہمارے مقامی سیاست دان تین تین کروڑ کے ہوگئے ہیں' تب سے ہماری خواہش تھی کہ ہمارے صحافی اور ادیب بھی قیمتی ہونے چاہئیں۔ سو حکومت نے کچھ صحافیوں میں بھی اضافہ کیا۔ موجود بجٹ میں علم و ادب کو قیمتی بنانے کا اہتمام ہے' اس سے پہلے تو ادیب شاعر کی یہ نشانی تھی کہ

اس کی جیب خالی اور ایش ٹرے بھری ہوئی ہوتی۔ غالب اور فیض جیسے شاعروں کے قیمتی شعر سستے کاغذ پر چند روپوں میں بازار سے مل جاتے۔ ہرا یرا غیرا معمولی رقم سے علامہ اقبال کا کل کلام خرید لیتا۔ گزشتہ حکومتیں میر' غالب' اقبال اور فیض کی تخلیقات کو اپنا قیمتی سرمایہ کہتی رہیں' لیکن صحیح معنوں میں اسے "قیمتی سرمایہ" موجودہ حکومت نے بنایا۔ اس ادبی حکومت کے ان اقدامات سے آج کے شاعروں کو جو فائدہ ہوگا' اس کا وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ ہمارے بہت سے شاعر صرف اس لیے بڑے شاعر نہ بن سکے کہ ان کا مجموعہ کلام چھپ گیا۔ اپنی کتاب چھپوانا دراصل دوسروں کو اپنے خلاف مواد مہیا کرنا ہے۔ ویسے بھی غیر مطبوعہ کلام بندے کی طرح ہوتا ہے۔ دوست اسے ایک نظر دیکھتے ہیں اور تعریف کرتے ہیں۔ جب وہ چھپ جاتا ہے تو پھر طوائف کی طرح اسے کوئی بھی خرید سکتا ہے۔ پبلشر تو رائٹر بیچتا ہے۔ بھلے وقتوں میں حکومت انہیں خرید لیتی تھی۔ اب ضرورت نہیں رہی کیونکہ ایک شاعر سے تو ایک بدکا ہوا گھوڑا حکمران کو زیادہ نقصان پہنچا سکتا ہے۔

کتابیں اور کاغذ مہنگا ہونے سے شاعر اپنا کلام نہ چھپوا سکیں گے اور باعزت زندگی گزاریں گے۔ ہمارے ایک فلمی شاعر کے بقول غلطیوں کے علاوہ ہماری شاعری میں کوئی چیز اوریجنل نہیں۔ اگرچہ کاغذ بڑی صابر شے ہے۔ سچ بھی سہ جاتا ہے' پھر بھی فی زمانہ کسی بھی کتاب کا سب سے قیمتی صفحہ اس کا خالی صفحہ ہی ہے۔ ہمیں تو شاعری کی کتاب پڑھنے کی بجائے بقول جون ایلیا شاعروں کا "گانا" سننے مشاعروں میں جانا پسند ہے۔ ہمارے پسندیدہ شاعر مظفر وارثی ہیں جس کی دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہم نے ان کی کوئی کتاب نہیں پڑھی اور دوسری یہ کہ ان کا ترنم بہت اچھا ہے۔ احمد فراز کی آواز بھی ہمیں پسند ہے' لیکن ان کی دو سے زیادہ غزلیں ایک وقت میں سن لیں تو مہاسے نکل آتے ہیں۔ مشاعروں کے اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ زخمی کانپوری کی بیوی نے ایک بار کہا: "کب سے کہہ رہی ہوں' ٹماٹر لا دو۔" بولے: "بیگم تھوڑی دیر اور صبر کرلو۔ شام کو مجھے مشاعرے پر تو جانا ہی ہے۔" البتہ کچھ شاعر مشاعروں میں لکھا ہوا پڑھتے ہیں۔ ہم نے ایک شاعر سے اس کی وجہ پوچھی تو بولے: "لوگ کہنے لگے تھے' مجھے لکھنا نہیں

آتا۔" دیکھا آپ نے الفاظ کس طرح زخمی کرتے ہیں' خصوصاً اس وقت جب آپ کی بیوی آپ پر ڈکشنری دے مارے۔

اس ادبی حکومت نے ادب ادیب سے مہنگا کر دیا۔ روس میں تو آج کل کوئی غریب آدمی ادب لکھ ہی نہیں سکتا۔ کاغذ اتنا مہنگا ہو گیا ہے کہ ادیب کو اپنا لفظ ایک روپے میں پڑتا ہے۔ شاید اسی لیے روسی ادب بڑا "رچ" ہے۔ موجودہ بجٹ کے بعد ہمیں بھی لفظوں کی قیمت کا اندازہ ہونے لگا ہے۔ ایک ادیب کا خیال ہے کاغذ مہنگا ہونے سے ادیب شاعر رف لکھا ہوا اس ڈر سے "نیٹ" نہیں کریں گے کہ ڈبل خرچہ ہوگا۔ سو وہ اسے ہی چھپوا دیں گے۔ ویسے پچھلے چند سالوں میں جو کتابیں چھپیں ہیں' انہیں پڑھ کر تو لگتا ہے' ہمارے رائٹر بڑے مستقبل شناس ہیں جنہوں نے برسوں پہلے ہی یہ شروع کر دیا تھا۔

و - ردی

وردی چاہے و۔ ردی ہی کیوں نہ ہو' پھر بھی اس کا اتنا احترام ہے کہ اسرائیلی پولیس میں شامل خواتین کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب بھی تم کوئی غیر اخلاقی حرکت کرنے لگو تو پہلے سرکاری وردی اتار دو۔ وردی کی افادیت کا اندازہ اس سے لگالیں کہ امریکہ کی ایک ریاست میں پولیس افسر کو شیر کھا گیا۔ اس سانحہ کی وجوہات جاننے کے لیے کمیٹی بٹھائی گئی جس نے حادثے کی وجہ یہ بتائی کہ افسر نے اس وقت وردی نہیں پہنی تھی۔ ہر ملک میں پولیس کی

وردی ایسی ہے جیسی ہمارے ہاں باجا بجانے والوں کی ہوتی ہے۔ ویسے انہیں جو مل جائے' اس کا باجا بجا بھی دیتے ہیں۔ البتہ ان کی زنانہ پولیس کی وردی دیکھ کر ہم نے گائیڈ سے پوچھا: "پینٹ سکن ٹائٹ ہے؟" بولا: "یہ سکن سے بھی ٹائٹ ہے۔" پوچھا: "آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" بولا: "اپنی سکن میں یہ محترمہ نیچے بیٹھ سکتی ہے' مگر اس پینٹ میں نہیں۔" انگریز جب ہندوستان کے حاکم تھے تو انہوں نے یہاں کی پولیس کو نیکریں پہنادی تھیں جس کا بڑا فائدہ ہوا۔ پولیس کی وردی پر کم کپڑا لگنے لگا۔ ہمارے وزیر داخلہ کی نظر بھی آج کل زنانہ پولیس کے لباس پر ہے۔ انہوں نے فرمایا ہے زنانہ پولیس کو شلوار کی بجائے پتلون پہنائی جائے گی کیونکہ شلوار قمیص میں وہ چوکس نہیں رہتیں۔ ویسے یہ سچ ہے' خاتون نے پینٹ پہنی ہو تو اسے بڑا چوکس رہنا پڑتا ہے۔ مزید کہا گیا ہے کہ شلوار میں زنانہ پولیس کو بھاگنے میں بھی مشکل ہوتی ہے۔ صاحب! ہم تو عورتوں کے بھاگنے کے خلاف ہیں' چاہے وہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر پولیس ایسی ہونی چاہیے جو بھاگتی نہ ہو۔ وزیر داخلہ نے زنانہ پولیس کی ساری ناکردگی پر شلوار ڈال دی ہے۔ شلوار تو وزیر داخلہ کی طرح ڈھیلا ڈھالا لباس ہے۔ آج تک پتہ نہیں چل سکا کہ شلوار واحد ہے یا جمع۔ کیونکہ یہ اوپر سے واحد اور نیچے سے جمع ہوتی ہے۔ البتہ باہر کے ملکوں میں ایسا لباس پہنے دیکھ کر لوگ آپ کی عیادت کرنے لگتے ہیں۔ پتلون کے استعمال سے ہماری مردانہ پولیس تو پہلے ہی اتنی تیز ہو گئی ہے کہ آپ کسی مجرم کی تلاش میں اس کے گھر پہنچیں تو اندر پولیس والا پہلے ہی موجود ہو گا۔

پولیس ایسا ڈیپارٹمنٹ ہے کہ ہم سنجیدگی سے اس کی تعریف بھی کریں تو سننے والے ہنسنے لگتے ہیں۔ البتہ اس کے بارے میں کوئی مزاحیہ بات کر دیں تو سب سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ایک دوست دن رات گلیوں میں پھرتا رہتا ہے' پھر اس نے سوچا مجھے اس کا معاوضہ بھی ملنا چاہیے اور وہ پولیس میں بھرتی ہو گیا۔ ایک دن ہم نے اسے بتایا کہ لوگ فیض احمد فیض صاحب کی اتنی عزت کرتے کہ ایک بار انہوں نے ریڑھی والے سے پھل لیا تو اس نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ جس پر وہ بولا: "فیض جتنی عزت تو معاشرے میں ہماری بھی ہے۔" یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک نقاد نے رائے دی کہ ماجد صدیقی اس دور کا غالب ہے۔ یاد رہے موصوف اس نقاد کے مقروض بھی ہیں۔ اب ایسا زمانہ آ گیا ہے کہ جس شخص کو سزاوار نہ ہوتے ہوئے سزا دی جائے

تو اس کا ذمہ وار وہ خود ہے۔ اسے کوئی قابل سزا کام کرنا چاہیے۔ پہلے پولیس کا کام عوام کو چوروں ڈاکوؤں سے بچانا ہوتا تھا' اب پولیس کا کام الٹ ہو گیا ہے۔ اب اس کا کام عوام سے وزیروں' مشیروں کو بچانا ہے۔ اس کے باوجود عوام سے پولیس کا بڑا مضبوط تعلق ہے۔ جی ہاں! بذریعہ ہتھکڑی۔ اب تو ہر علاقے میں تھانہ بنا دیا گیا ہے تاکہ جرائم پیشہ افراد کو دور نہ جانا پڑے۔ گزشتہ بیس سالوں کے دوران امریکہ میں جرائم کی تعداد دوگنی ہو گئی ہے۔ شکر ہے ہمارے ہاں یہ صلاحیتیں نہیں' ورنہ ہمارے ہاں جرائم کئی "گناہ" بڑھ جاتے۔

زنانہ پولیس کے پتلون پہننے پر سب سے زیادہ پریشان پشتو فلموں کے ہدایت کار ہیں کہ اب ان کی فلمیں کون دیکھے گا۔ اب تو اردو پنجابی فلموں کو ہٹ کرنے کے لیے بھی زنانہ پولیس کو پتلون پہنا دی جاتی ہے' جو اکثر اتنی فٹ ہوتی ہے کہ دیکھنے والے کو فٹ پڑنے کا اندیشہ رہتا ہے۔ لگتا ہے انہی زنانہ پتلونوں کی کارکردگی سے متاثر ہو کر ایسا سوچا گیا ہے کہ فلموں میں پتلون سے ناظرین قابو کیے جا سکتے ہیں تو مجرم کیوں نہیں کیے جا سکتے۔ ہو سکتا ہے' وفاقی وزیر فلمی پولیس کو بھی اپنے انڈر سمجھتے ہوں' جیسے غلام دستگیر خان جب لیبر منسٹر بنے تو وہ سمجھتے تھے لیبر رومز بھی ان کے ماتحت ہیں۔

ہمیں ڈر ہے کہ زنانہ پولیس کا یہ لباس بھی سنسر کی زد میں نہ آ جائے۔ کچھ لوگ عریانی اور فحاشی کی تلاش میں سنسر بورڈ میں آ جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں پشتو فلموں کے سنسر بورڈ کے رکن نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ ڈاکٹر نے اسے کہا تھا کہ اگر ہر دس سیکنڈ کے بعد آنکھیں نہ جھپکاؤ گے تو اندھے ہو جاؤ گے۔ ایک مکینک نے ہمیں بتایا کہ جب سے مجھے دمے کا مرض شروع ہوا ہے' میں پشتو فلم دیکھنے جانے لگا ہوں تاکہ میرے گہرے سانس ضائع نہ ہوں۔ اب اسے سینما جانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔ صاحب! کارل مارکس کتنا دوراندیش تھا' اس نے بلیو فلموں کے آغاز سے ساٹھ سال پہلے ہی کہہ دیا تھا: "دنیا کے محنت کشو! مل کر ایک ہو جاؤ۔" 1975ء میں ہمارے ہاں فحاشی اور عریانی کے خلاف ایسی تحریک چلی کہ میڈیکل کی کتابیں بھی سنسر ہونے لگیں۔ ہم گائنی کی کتاب لینے جاتے جو سنسر کے بعد آرتھوپیڈک کی لگتی۔ سرحد میں تو اس قدر پردہ ہے کہ وہاں تو بکریوں کو بھی بریزیئر پہنا کے رکھتے ہیں۔ یہاں زنانہ پولیس پتلون پہن کر چل رہی ہو گی تو لوگ یہی سمجھیں گے کہ پشتو فلم چل رہی

ہے۔ زنانہ پولیس پہلے زنانہ ہے، پھر پولیس۔ ہمارے ایک دوست اپنی کانسٹیبل بیوی کو تھانے
چھوڑنے اور لے جانے جاتے ہیں۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولے: "زمانہ ہی ایسا ہے۔" خیر اس
زمانے میں تو بزدل ہونے کے لیے بھی بڑا حوصلہ چاہیے۔ ویسے کئی بہادر لیڈی کانسٹیبل بھی
ہیں۔ ایک ایسی محترمہ مجرم کے بارے میں کہہ رہی تھیں کہ میں نے اس کا تعاقب آخری
سانس تک کرنا تھا مگر وہ بزدل بھاگا ہی نہیں۔ تا اطلاع "لاثانی" زنانہ پولیس نے پتلونیں پہننے
سے انکار کر دیا، جس پر ہیجڑوں کے ایک گروپ نے کہا ہے: "ہمیں پولیس میں بھرتی کر لیں اور
جو دل چاہے پہنائیں۔ پہنانے پر ہمیں بھی کوئی اعتراض نہیں رہا۔ پھر ہماری درمیانہ پولیس
بیک وقت زنانہ اور مردانہ تھانوں میں کام کر سکتی ہے۔ ہمارا ذہن بھی دوسروں سے دوگنا
ہے۔ ہم ڈبل مائنڈڈ ہیں۔ ہم ملاوٹ کے بھی خلاف ہیں کیونکہ ہم خود ملاوٹ کے ستائے
ہوئے ہیں۔ اتنے تیز ہیں کہ ڈاکے پر پولیس لیٹ ہو جاتی ہے ناکے پر ہم کبھی لیٹ نہیں
ہوئے۔ ٹریفک کے دس سپاہی مل کر بھی ہماری ایک چھوری جیسی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں
کر سکتے، کیونکہ لوگ ٹریفک کے اشاروں پر نہیں رکتے۔ ہمارے اشاروں پر رکتے ہیں۔"
ہو سکتا ہے درمیانہ پولیس کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے زنانہ پولیس پینٹ کس لے اور
پینٹ کی طرح چست ہو جائے۔ ویسے تو پتلون مردانہ پولیس کی کارکردگی بھی بہتر نہیں
بنا سکی۔ سو اگر لباس ہی سے پولیس کو چست کرنا ہے تو پھر انہیں لاچے پہنائیں۔

علم فی کلوگرام

گلف نیوز کے مطابق تھائی لینڈ کی وزارت تعلیم نے بستوں کے غیر ضروری وزن
سے نجات دلانے کے لیے کنڈر گارٹن کے طلبہ کے لیے ایک کلوگرام، پرائمری دو
کلوگرام اور ہائی سکول کے طلبہ کے لیے تین کلوگرام وزن رکھا ہے۔ اس حساب سے تو
کالج کے طلبہ کا بستہ چار کلوگرام کا ہوگا۔ ہمارے ہاں تو جوں جوں کلاس بڑھتی ہے،
کتابیں گھٹتی ہیں۔ کالجوں میں تو صرف "کاپی" سے کام چلتا ہے۔ بستہ ہوتا بھی ہے تو وہ

بستہ ب ہی ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے کہا' مجھے پتہ چل جاتا ہے یہ کلاس انڈر گریجویٹس کی ہے یا گریجویٹس کی۔ ہم نے پوچھا: ''کیسے؟'' بولے: ''جب میں کہتا ہوں 'گڈ آفٹرنون۔ تو انڈر گریجویٹس جواب میں گڈ آفٹرنون کہتے ہیں۔ لیکن جب میں گریجوایٹس کو یہ کہتا ہوں تو وہ اس کے نوٹس لینے لگتے ہیں۔'' اگرچہ ہمارے ہاں علم کا کوئی وزن نہیں رہا' پھر بھی کلاس جتنی چھوٹی ہوتی ہے' بستے اتنے بڑے ہوتے ہیں۔ سکول کے بچوں کے وزنی بستے دیکھ کر ہمیں خوشی ہوتی ہے کہ ہم نے بھلے وقتوں میں تعلیم مکمل کر لی۔ ورنہ ہم سے تو یہ اٹھائے ہی نہ جاتے۔ لوگ ہمیں دیکھ کر یہی پوچھتے' آپ کس ہسپتال میں ہوتے ہیں؟ بچپن میں یہی خرابی ہے کہ یہ ابتدائی عمر میں آ جاتا ہے اور سیاست دانوں کو ملنے کے بعد لگتا ہے' پھر یہ ساری عمر نہیں جاتا۔ عظیم باکسر محمد علی کہتا ہے: ''لوئیس ویلی میں جب میں بچہ تھا تو والدین نے مجھے نئی سائیکل لے کر دی۔ میں اسے جیم کے باہر کھڑی کر کے اندر گیا۔ باہر آیا تو کسی نے چرالی تھی۔ مجھے شدید صدمہ ہوا۔ ساتھ ہی ایک پولیس والا رہتا تھا۔ میں اس کے پاس گیا اور بتایا کہ جس لڑکے نے میری سائیکل چرائی ہے' میں اسے نہیں چھوڑوں گا۔ جب پولیس والے کو پتہ چلا کہ مجھے تو لڑنا ہی نہیں آتا تو اس نے کہا' پہلے لڑنا سیکھو۔ اس طرح میں باکسنگ کی طرف آیا۔ اس دن تو چور میرے ہاتھ نہ آیا لیکن ہر بار جب میں رنگ میں اترتا تو دوسرے مکے باز کو دیکھ کر میں اپنے آپ سے یہی کہتا' اسی نے میری سائیکل چرائی تھی۔'' ہمارے ہاں تعلیم یافتہ لوگوں کا جو رویہ ہے' اس سے لگتا ہے وہ بڑے ہو کر ہر کسی کو اپنے بستے کا قصوروار سمجھتے ہیں۔ بچوں کی پرورش پر کئی کتابیں لکھی گئیں' پر وہ اتنی بہتر نہیں کیونکہ آج کے بچوں کی پرورش کے لیے پچاس سال پہلے کے بچوں کی کتابیں کیسے مفید ہو سکتی ہیں۔ آج کے بچے تو اتنے سائنٹفک ہیں کہ ہمارے دوست کے بیٹے نے زمین پر گرا کر گلدان توڑ دیا۔ ہم نے ڈانٹا تو بولا۔ یہ میری وجہ سے نہیں گرا۔ یہ تو کشش ثقل کی وجہ سے گرا ہے۔ آج کا انوکھا لاڈلا کھیلنے کو چاند نہیں مانگتا' کیونکہ اسے پتہ ہے چاند کرہ ہے۔ تھائی لینڈ ہی کے ایک سکول کی بچی کا واقعہ ہے۔ اس کا مذہبی رہنما باپ اسے کہانی سنایا کرتا تھا۔ ایک رات اس نے بڑی ہی مزیدار کہانی سنائی۔ لڑکی بڑی متاثر ہوئی۔ اس نے باپ سے پوچھا: ''پاپا یہ

واقعی سچی کہانی ہے یا آپ واعظ کر رہے ہیں؟''

بچپن ہر کسی کو اچھا لگتا ہے جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ بچپن میں آپ کے بچے نہیں ہوتے۔ آپ کے بچے کتنے آگے جائیں گے' یہ اس پر ہے کہ آپ نے گاڑی میں کتنا پٹرول چھوڑا ہے۔ آج کل بچوں کو کہا جاتا ہے' پڑھو لکھو گے نہیں تو پھر ہر جگہ کیش ہی دیا کرو گے۔ سرکاری سکولوں میں تو چھٹیاں ہی رہتی ہیں۔ ایک بچہ کہہ رہا تھا'' ہم تو چھٹیوں سے اتنا تھک جاتے ہیں کہ تھکاوٹ اتارنے کیلئے اور چھٹیاں کرنی پڑتی ہیں۔'' بچے امتحان پاس کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں' یہاں تک کہ پڑھ بھی سکتے ہیں۔ سکولوں کی افادیت کے سب قائل ہیں کہ آج بھی انڈہ سکول میں بازار سے سستا ملتا ہے۔ ہمیں یاد ہے ہمارے ڈرائنگ ماسٹر نے تو مرغا بنانا سکھا ہی ہم پر تھا' لیکن آج کل کے طلباء خود ہی استاد ہیں۔ جرمن کہاوت ہے جو خود اپنا معلم ہوتا ہے' اس کے شاگرد احمق ہوتے ہیں۔ حکومت کے نزدیک بچوں کے بارے میں سوچنا بچگانہ کام ہے۔ فی زمانہ لوگ تھوڑے بچوں کے ساتھ گزارا کر لیتے ہیں' باقی ماندہ شور شرابا ٹی وی بچا لیتا ہے۔ ٹی وی کی ایجاد کا مقصد دراصل ان پڑھوں کو عینک لگانے کا بہانہ پیدا کرنا تھا۔ پی ٹی وی ایسا ہے کہ عقل مند اور بے وقوف دونوں ایک سال دیکھ لیں تو پہچاننا مشکل ہو جائے گا کہ عقل مند کون تھا۔ وسط ایشیائی ریاستوں میں تو تعلیم ہی نہیں' تعلیم یافتہ بھی عام ہیں۔ وہاں کے تو جاہل بھی تعلیم یافتہ ہیں۔ ہم نے ازبکستان میں تابانی گروپ کے منیجر کے گھر برتن دھونے والی ملازمہ ایم اے بیالوجی دیکھی۔ نیشنل بینک آف پاکستان ازبکستان برانچ کے منیجر کے گھر صفائی کرنے والی ملازمہ ہسٹری میں پی ایچ ڈی تھی۔ پہلے علم ایک دولت تھا' اب دولت ایک علم ہے' جس کا عالم بننے کے لیے لوگ سیاست میں آتے ہیں۔ پکاسو نے ایک بار کہا تھا: ''میں حیران ہوں کہ لوگ آرٹ دیکھنے کی بجائے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی پرندے کا گانا سمجھنے کی کوشش کرنا۔ بھلے لوگو! اسے سنو اور انجوائے کرو۔'' ہم سیاست کو بھی آرٹ سمجھتے ہیں یعنی صرف دیکھتے ہیں۔ کبھی سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ جرمن کہاوت ہے عاشق' شاعر' سیاستدان اور مغنی کو جھوٹ بولنے کا حق حاصل ہے۔ اگرچہ ہماری خواہش ہے کہ ان سب کو سچ بولنے کا حق بھی ملنا چاہیے۔ ہم سمجھتے ہیں برے

سیاست دان سے اچھا پلمبر' معاشرے کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔ سیاست دانوں سے تعلیم کی باتیں کرو تو انہیں نیند آنے لگتی ہے۔ اس لیے ہم بچوں کو ہی کہتے ہیں کہ وہ بستوں کے وزن تلے ہنسیں لیکن یہ بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں ان کے ساتھ اس بچے کی طرح نہ ہو جو ماں کے پاس روتا ہوا آیا اور بولا: "ابا جان دیوار میں کیل گاڑ رہے تھے تو ہتھوڑا ان کے ہاتھ پر لگ گیا۔" ماں بولی: "بیٹا بہادر بچے اتنی سی بات پر رویا نہیں کرتے' تمہیں تو ہنس دینا چاہیے تھا۔" "امی ہنسا ہی تو تھا۔"

دولہوں کا ملک

انگولا شادی شدوں' سویڈن غیر شادی شدوں' جاپان بیویوں' روس بچوں' امریکہ اور انگلینڈ مطلقوں کے ملک ہیں جب کہ پاکستان دولہوں کا ملک ہے۔ یہاں کے دولہے اپنی پائیداری اور آفٹر سیل سروس میں اتنے مشہور ہیں کہ بیرون ملک مقیم پاکستانی گھر میں ہر چیز بدیسی رکھتے ہوئے بھی اپنی بچیوں کے لیے دیسی دولہے لینے پاکستان کا ہی رخ کرتے ہیں۔ گھریلو سامان اور پراپرٹی کے اشتہارات کے ساتھ ساتھ دولہے دستیاب ہیں کہ اشتہاروں

سے پاکستانی اخبار بھرے ہوتے ہیں۔ شاید اسی شہرت سے متاثر ہو کر اخباری اطلاعات کے مطابق لیڈی ڈیانا بھی دولہے کی تلاش میں پاکستان آ رہی ہیں۔ سنا ہے اس خبر سے مولانا عبدالقادر آزاد بہت خوش ہیں کیونکہ وہ ایک عرصہ سے ڈیانا کو مشرف بہ اسلام کرنے کے موڈ میں ہیں۔ ڈیانا کا تعلق شاہی خاندان سے ہے۔ مولانا عبدالقادر آزاد بھی اسی نام کے محلے میں مقیم ہیں۔ دنیا میں سب سے آزاد 'نو آزاد امیدوار' ہی ہوتا ہے لیکن ہمارے ہاں سب جسے آزاد کہتے ہیں' وہ مولانا آزاد ہی ہیں۔ شکل ایسی کہ جب ان کی شادی نہیں ہوئی تھی' تب بھی شادی شدہ لگتے تھے۔ سکول میں بھی ان کا پسندیدہ فقرہ "قبول ہے' قبول ہے' قبول ہے۔" ہی تھا۔ ہر وقت حق کہنے اور "حق کرنے" کو تیار رہتے ہیں۔ دیکھتے ہیں ڈیانا کو راہ "حق" پر کیسے لاتے ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں مشہور عورت سے شادی کرنا دراصل اس سے نہیں' اس کی شہرت سے شادی کرنا ہے۔ ایک ایسی ہی محترمہ کی حالت نازک تھی۔ ڈاکٹر نے اس کے خاوند سے کہا: "آپ پریشان تو ہوں گے مگر ہمیں افسوس ہے کہ اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔" یہ سن کر خاوند بولا: "کوئی بات نہیں ڈاکٹر صاحب۔ مجھ میں اتنی قوت برداشت ہے۔ جہاں میں اتنے برس پریشان رہا' چند گھنٹے اور رہ لوں گا۔" ہمارے ہاں شادی سے پہلے لڑکی کو دیکھنا برا سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات شادی کے پچیس سال بعد بھی۔ لیکن ڈیانا کو جتنا ہم نے دیکھا ہے' اتنا چارلس نے نہ دیکھا ہوگا۔ زندگی میں دو چیزیں حاصل کرنے کے قابل ہوتی ہیں۔ پہلی چیز وہ جو آپ چاہتے ہیں اور دوسری چیز اس سے لطف اندوز ہونا۔ دوسری کا حصول پہلی سے مشکل ہے۔ اسے تو شہزادہ چارلس بھی حاصل نہ کر سکا۔ ڈیانا اور چارلس کی طلاق کی جو دو وجوہ تھیں۔ ایک کا نام شہزادہ چارلس اور دوسری کا نام لیڈی ڈیانا تھا۔ ویسے بھی وہاں اتنی جلدی طلاقیں ہوتی ہیں کہ ایک اداکارہ نے بالوں میں رولر لگا کر شادی کی تاکہ طلاق تک بال سیٹ ہو جائیں۔ امریکہ اور برطانیہ تو ویسے ہی مطلقوں کے ملک ہیں۔ یہ عالم ہے کہ امریکی ایکٹریس جین ایکرو اور روڈلف والیسیو نے شادی کا بندھن باندھتے ہوئے ہمیشہ ساتھ رہنے کی قسم کھائی اور ٹھیک 45 منٹ بعد دونوں میں طلاق ہو گئی۔ ہم نے اپنی ممتاز ادیبہ کی شادی کی گولڈن جوبلی پر ان سے پوچھا: "آپ کی اس

طویل خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز کیا ہے؟" انہوں نے کچھ دیر منہ میں کچھ گنا اور پھر کہنے لگیں: "ہم دونوں کو تلخ سوالوں کا جواب دینے سے پہلے دس تک گنتی کرنے کی عادت ہے۔" "ایک ڈچ لڑکی نے ماں سے پوچھا: "ماں بیاہ کیا ہوتا ہے؟" ماں بولی: 'کاتنا' بچے جننا اور رونا۔" ڈیانا نے شادی کے بعد آخری دو کام ہی کیے۔ ڈچ کہاوت ہے جو تین بچوں والی عورت سے شادی کرتا ہے' وہ چار چوروں سے بیاہ رچاتا ہے۔ ڈیانا اگرچہ بچوں والی ہے پھر بھی اس کے بارے میں کئی شادی شدہ کنواروں کی طرح دن کو خواب دیکھتے ہیں۔ رات کو شاید اس لیے خواب نہیں دیکھتے کہ وہ اندھیرے میں نظر ہی نہیں آتے۔ پھر بچوں سے پاکستانیوں کو اتنا پیار ہے کہ ہمارے ہاں تو گاؤں کی عورتیں پیشہ کے خانے میں بچوں کی تعداد لکھتی ہیں۔ خوشحال خاں خٹک کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں سے کون واقف نہیں۔ ان کے 58 لڑکے اور 32 لڑکیاں تھیں۔ ممتاز مفتی سے لے کر مصطفیٰ کھر تک بے شمار دولہے ہیں جنہیں بچوں سے اتنا پیار تھا کہ جب بھی شادی کی' بچوں والی عورت سے کی۔ زیادہ باتیں کرنے والے کو باتونی اور سننے والے کو شوہر کہتے ہیں۔ عورتیں زیادہ باتیں شاید اس لیے کرتی ہیں کہ مرد سمجھ نہ سکیں۔ بہرحال یہ طے ہے کہ بڑی عورت کا خاوند ہونا دراصل چھوٹا ہونا ہے۔ یہاں بڑی عورت سے مراد تن اور فن میں عروج حاصل کرنے والی اداکارہ انجمن نہیں ہے' ویسے بھی اداکارہ سے شادی کرنا تو میک اپ کی دکان پر ملازمت کرنا ہے۔ 64 سالہ الزبتھ ٹیلر جو پلاسٹک سرجری کے بعد 32 سال کی لگتی ہے' کہتی ہے: "پلاسٹک سرجری سے عورت کی عمر کم نہیں لگتی' اس سے شادیاں بھی کم لگنے لگتی ہیں۔" اس کے خیال میں دوسرے لائسنسوں کی طرح میرج لائسنس کی بھی ہر سال تجدید ہونا چاہیے۔ دنیا میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو شادی شدہ ہوتے ہیں اور دوسرے وہ جو امن پسند ہوتے ہیں۔ بھکشو تشدد کے اس قدر خلاف ہوتے ہیں کہ وہ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں نہ شادی کرتے ہیں۔ اگر بیوی خاوند کے ساتھ عزت سے پیش آئے تو اس کا مطلب ہے کہ وہ اسے خاوند مانتی ہی نہیں۔ جوہنسبرگ کے ایک ہفت روزہ نے لکھا کہ ایک بار ونی منڈیلا نے صدر منڈیلا کی اتنی پٹائی کی کہ صدر کے گن مین کا صبر جواب دے گیا اور اس نے پستول نکال کر کہا کہ ونی نے اگر اب ہاتھ اٹھایا تو وہ گولی چلا

دے گا۔ اس کے بعد سے منڈیلا گارڈز کے بغیر تنہائی میں ونی سے نہ ملتا' لیکن ڈیانا چارلس کے ساتھ ہمیشہ اس قدر احترام سے پیش آتی کہ لگتا' ان کے درمیان میاں بیوی کا رشتہ ہے ہی نہیں۔ ہمارے اور انگریزوں کے مزاج میں اتنا فرق ہے' جتنا رنگوں کا ہے۔ انگریز لنچ' سہ پہر کی چائے اور ڈنر کو عبادت سمجھتے ہیں۔ ہم عبادت نہیں سمجھتے۔ ہم تو دل لگا کر رغبت سے کھاتے ہیں۔ انگریز پلاٹونک محبت کم کرتے ہیں' ہمارے ہاں پلاٹونک محبت کا یہ عالم ہے کہ ہمیں جونہی کوئی خالی پلاٹ نظر آئے' ہم اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ کراچی کی آب و ہوا پاکستان کے حالات' امریکہ کے وعدہ اور عورت کے مزاج پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ مرد کو ایک روپے والی چیز پسند آجائے تو وہ اسے دو روپے میں بھی خرید لے گا' لیکن عورت کو دو روپے والی چیز ناپسند بھی ہو تو اسے ایک روپے میں خریدنے پر تیار ہو جائے گی۔ ہم کو یہ تو نہیں پتا کہ ڈیانا کو کونسا دولہا پسند آئے گا' لیکن اتنا پتا ہے وہ سیاسی دولہا نہ ہو گا' کیونکہ وہ اور جھوٹا ہوتا ہے۔ ڈیانا لو میرج کی قائل ہے۔ فرانسیسی کہاوت ہے: ''معاشقے کی شادی میں راتیں اچھی اور دن برے ہوتے ہیں۔'' پتہ نہیں یہ برے دن کس کے آئے ہیں۔ ہمیں تو لگتا ہے ڈیانا کی پہلی شادی دراصل اس کی دوسری شادی کی تیاری تھی۔ پاکستان میں ناتجربہ کار دولہوں کے ساتھ ساتھ کئی تجربہ کار دولہے بھی ڈیانا کو شہزادی سمجھ کر سہارا دینے کے لیے تیار ہیں' لیکن ایک دولہے نے ہمیں بتایا کہ میں ڈیانا کو شہزادی یا دولت مند سمجھ کر اسے شادی کی آفر نہیں کر رہا' بلکہ خلوص نیت سے صرف اسے چاہتا ہوں۔ ایسے ہی ایک صاحب کو انگلینڈ کے ایک امیر کبیر گھر کی لڑکی پسند آگئی۔ شادی کے لیے اس کے باپ سے بات کی تو اس نے کہا: ''اگر میری بیٹی کے پاس ایک پائی بھی نہ ہوتی' پھر بھی اس سے شادی کر لیتے؟'' موصوف بولا: ''ہاں۔'' تو لڑکی کے والد نے کہا: ''جاؤ اپنا راستہ ناپو۔ ہماری فیملی میں پہلے احمق کم نہیں ہیں۔''

ادا ستان

ہم تو محترمہ حکومت کی چھائیوں اور اچھائیوں پر ہی نظر رکھتے ہیں۔ سو ہمیں اس پر خوشی ہوئی کہ حکومت نے ہر شعبے میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لانے کے لیے جرائم میں بھی عورتوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے ان کی سزائے موت معاف کر دی ہے۔ ہو سکتا ہے مزید رعایتیں دی جائیں۔ جیسے ایک سرجن نے اپنے ہسپتال کی مشہوری کے لیے اعلان کیا تھا کہ جو دو بڑے آپریشن ہمارے ہسپتال سے کرائے گا' اس کے بچے کا

آپریشن فری کر دیا جائے گا۔ ویسے تو خواتین ہر فیلڈ میں مردوں سے آگے ہیں' اس لیے ہم نے مردوں کو اکثر عورتوں کے پیچھے ہی دیکھا ہے۔ سپین میں تو کرس ٹینا نے بل فائٹنگ میں بھی مردوں کو اپنے پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ کسی نے پوچھا: "آپ پہلی بار بل فائٹنگ کے لیے میدان میں اتریں تو آپ کو اس کا تجربہ تھا؟" بولی: "ہاں۔ میں شادی شدہ تھی۔
ہماری حکومت نے خواتین کو کچھ کر کے دکھانے کا نادر موقع بلکہ "نادر شاہی" موقع ہے۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ مرد بری طرح جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ عورتیں اچھی طرح کرتی ہیں لیکن کیوں؟ وجہ کوئی ماہر نفسیات ہی بتا سکتا ہے۔ ویسے تو کہتے ہیں عورتوں کی نسبت مردوں میں تحلیل نفسی جلد ممکن ہوتی ہے۔ مردوں کو واپس بچپن میں لانا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ پہلے ہی اس سے زیادہ دور نہیں ہوتے۔ مردوں کا عورتوں سے رویہ دو رویہ ہوتا ہے۔ اس لیے یہ مت دیکھیں مرد جس کے ساتھ ہے اس کے ساتھ اس کا رویہ کیسا ہے یہ دیکھیں' جسے وہ چھوڑتا ہے اس کے ساتھ کیسا ہے۔ ارسطو کہتا ہے جب قدرت کسی کو مرد بنانے میں ناکام ہوتی ہے تو اسے عورت بنا دیتی ہے۔ میڈیکل سائنس کہتی ہے "ہر بچہ پہلے لڑکی ہوتا ہے' بعد میں کچھ لڑکا بن جاتے ہیں۔" آج تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ پاکستانی جرائم کیوں کرتے ہیں۔ جب کہ بددیانتی کرنے کے قانونی راستے موجود ہیں۔ شاید ان راستوں پر پولیس سے مڈبھیڑ کا خطرہ ہو۔ ایک مجرم کہہ رہا تھا' میں جب بھی برائی کے راستے پر چلتا ہوں' اس راستے پر پولیس ہوتی ہے۔ باہر کی پولیس وہ چیزیں ڈھونڈتی ہے جو کھوئی ہوتی ہیں۔ ہماری وہ ڈھونڈتی ہے جو ابھی کھونا ہوتی ہیں۔ ہم نے ایک صحافی سے پوچھا "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ 'یہ پولیس والا لیفٹ ہینڈڈ ہے یا رائٹ ہینڈڈ؟" کہا: "آسان ہے۔ اگر وہ اپنی تمام رقم دائیں جیب میں رکھتا ہے تو وہ لیفٹ ہینڈڈ ہے۔"
کہتے ہیں کرائم کبھی پے نہیں کرتا۔ شاید یہ اس لیے کہتے ہیں کہ جب یہ پے کرتا ہی تو اسے کرائم نہیں کہا جاتا۔ ہمارے ہاں برا کام وہ ہوتا ہے جو دوسرا کر رہا ہوتا ہے اور بڑا کام وہ جو آپ خود کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں نور جہاں کی عمر اور پاکستان کے حالات میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں پاکستان سے کرپشن کا خاتمہ تو ممکن ہے۔ کسی مترجم کے ذمے لگائیں۔ وہ اس لفظ کا اردو میں ترجمہ کر دے۔ یوں "کرپشن" سے تو جان چھوٹ سکتی

،۔ باقی جرائم میں کمی بھی اس صورت ممکن ہے کہ ان پر سزائیں ختم کر کے ٹیکس لگا دیئے یں۔ یہی نہیں' اس سے بجٹ کا خسارہ بھی پورا ہو جائے گا۔ اگرچہ ہر سال بجٹ کا خسارہ ں ہی ہوتا ہے جو جون میں ہماری جون بدل دیتا ہے۔ بجٹ اور پلان میں یہ فرق ہوتا ہے کہ پ جو کرنا چاہتے ہیں' اسے پلان کہتے ہیں اور جس وجہ سے نہیں کر پاتے' اسے بجٹ کہتے ہے۔ عوام کے پاس آج کل سر چھپانے کو وگ ہی رہ گئی تھی۔ اس کی قیمت پر بھی 55 فیصد س لگا دیا گیا۔ اس پر امجد اسلام امجد کو احتجاج کرنا چاہیے۔ بال کٹوانے پر ٹیکس تو شاید سکھ ہب سے خیر سگالی کے طور پر لگایا گیا ہو لیکن بجٹ کے بعد ہم بال کٹوانے گئے تو باربر نے 'بال کٹوانے کے چالیس روپے۔" پوچھا: "شیو کرنے کے؟" کہا: "پانچ روپے۔" عرض "پھر ہمارے سر کی شیو کر دو۔" پشتو کہاوت ہے 'ڈوبتا آدمی استرے کو پکڑ لیتا ہے۔ اس رح استرا حکومت کے ہاتھ آگیا ہے۔ تاجر بھی ٹیکس کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں۔ ارے خیال میں وہ یہ سب حکومت کی بہتری کے لیے کر رہے ہیں۔ جیسے ہمارے ایک رحوم محقق اور نقاد ستار طاہر فرنیچر خریدتے ہوئے بڑا بھاؤ تاؤ کر رہے تھے۔ ہم نے انہیں ہا: "آپ نے ادھار فرنیچر لینا ہے۔ پھر آپ ادھار لے کر واپس بھی نہیں کیا کرتے' پھر یوں اتنا بھاؤ تاؤ کر رہے ہیں؟" بولے: "دکاندار میرا دوست ہے۔ میں چاہتا ہوں اسے کم سے کم نقصان ہو۔" ہمارے ہاں آج کل جو فکشن لکھا جا رہا ہے' اس میں انکم ٹیکس کے ریٹرن بھی شامل ہیں۔ تنخواہ دار بے چارا ایک تنخواہ سے حکومت اور گھر کیسے چلائے؟ ٹیکس دینا کوئی نئی بات نہیں۔ ٹیکسلا شہر کو ٹیکسلا کہتے ہی اس لیے ہیں کہ جو حملہ آور فتح کرتا' وہ یہاں کے باشندوں سے کہتا: "ٹیکس لاؤ۔" یوں اس کا نام "ٹیکس لا" پڑ گیا۔ اب تو پورا ملک ہمیں "ٹیکس لا" لگنے لگا ہے۔ غریب کی داستان 'اداستان' بن گئی ہے۔ پشتو محاورے کے مطابق غریبوں کے گھر مسجد لگتے ہیں یعنی فرنیچر اور گھریلو سامان کے بغیر۔ ایک سیانا کہتا ہے: "حکومت غریبی ختم کرنا چاہتی ہے مگر میرے خرچے پر۔" جرائم کم کرنے کے ہر ملک کے اپنے طریقے ہیں۔ کچھ ملکوں میں پولیس کم کر کے یہ مقصد حاصل کر لیا گیا۔ جرمنی کی رکن پارلیمینٹ لورسل نے جنسی تشدد' چوری' ڈکیتی اور دیگر جرائم روکنے کے لیے تجویز پیش کی تھی کہ غروب آفتاب کے بعد مردوں کے سڑکوں پر نکلنے پر پابندی لگا دی جائے۔ بلجیم

حکومت نے جیلوں میں مجرموں کو بیویوں کے ساتھ رکھ کر جرائم کم کر لیے، جس کی وجہ کوئی شادی شدہ ہی بتا سکتا ہے۔ ہمیں اپنے ایک مقبول اداکار کا واقعہ یاد آگیا۔ پروڈیوسر نے کہا "شوٹنگ ساری رات چلے گی' اس لیے وہ اپنی بیوی کو بتا کر آئے کہ اسے ساری رات گھر سے باہر رہنا ہے۔" اداکار بولا: "سارے خطرناک کام کرنے کے لیے ڈپلی کیٹ ہیں' تو پھر میری بیوی کو یہ اطلاع دینے کا کام اسی سے کیوں نہیں لیتے۔" اگرچہ شوپنہار کہتا ہے' عورتوں اور مذہبی رہنماؤں کو آزادی دینا خطرناک ہوتا ہے۔ پھر بھی امریکہ میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ پہلے وہاں عورتیں مردوں کے قتل کا جو سامان اپنے پرس میں رکھتیں' وہ صرف لپ اسٹک تک محدود ہوتا۔ اب تو اسٹک اور پستول بھی رکھتی ہیں۔ اللہ نے جسے توفیق دی ہے' وہ ہیرے جواہرات جڑے دستے والا پستول رکھتی ہیں۔ ہمارے ہاں چونکہ عورت کو مرد سے کمتر سمجھا جاتا ہے' سو ہو سکتا ہے اس کے جرم کو بھی کمتر سمجھتے ہوئے حکومت نے ان کی سزائے موت ختم کر دی ہو۔ شریعت کی رو سے دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہوتی ہیں۔ اسی لیے ایک زمانے میں جب سپیکر کی غیر حاضری میں ایک اجلاس کی صدارت بیگم شاہ نواز کو کرنا تھی تو ایک رکن نے کہا: "شریعت کی رو سے دو عورتیں ایک مرد کے برابر ہیں۔ اس لیے سپیکر کی کرسی پر ایک عورت کی بجائے دو عورتیں بیٹھیں۔" یہ تو بھلا ہو' آصف زرداری کا جس کی وجہ سے بے نظیر دور میں یہ کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ورنہ ہو سکتا تھا کوئی مذہبی جماعت کہتی کہ دو وزیراعظم ہوں۔ ہو سکتا ہے حکومت عورت کے ایک قتل کرنے کو نصف قتل سمجھتی ہو۔

ہمارے ہاں وزیراعظم کو سزائے موت دینے کا بھی رواج ہے۔ سو ممکن ہے محترمہ بے نظیر بھٹو نے سزائے موت ختم کر کے خود کو تسلی دی ہو' لیکن کہا جا رہا ہے یہ سب عورتوں کی بھلائی کے لیے کیا گیا ہے۔ جس پر عورتوں کی حالت ویسی ہی ہے جیسی اس ڈاکٹر کی بات سن کر مریض کی ہوئی تھی' جس نے کہا تھا: "مبارک ہو۔ آپ کے کان کا آپریشن کامیاب ہوا۔" مریض بولا: "کیا کہا؟ ذرا زور سے بولو۔"

جملہ تیموریہ

ہم کئی دنوں کے بعد وطن واپس آئے ہیں تو یہاں کے حالات جوں کے توں دیکھ کر عجیب سی خوشی ہو رہی ہے۔ بقول عطاء الحق قاسمی حالات کو جوں کا توں پا کر اس لیے خوشی ہو رہی ہے کہ ہمیں یقین ہو گیا ہے کہ حالات کی خرابی کی وجہ ہم نہیں ہیں ورنہ ہماری غیر موجودگی میں حالات بہتر ہو چکے ہوتے۔ ہم ازبکستان رائٹرز یونین کی دعوت پر عطاء الحق قاسمی' امجد اسلام امجد اور طاہر اسلم گورا کے ساتھ تاشقند گئے ہوئے تھے۔ دو

سال قبل بھی ہم تاشقند گئے تھے۔ تب اور اب میں یہ فرق تھا کہ پہلے لڑکیاں پاکستانیوں کو دیکھ کر مسکراتی تھیں اب ہنسنے لگی تھیں۔ پچھلی بار ہمیں تاشقند میں امیر تیمور گھوڑے پر سوار ملا تھا اس بار ازبکوں پر سوار نظر آیا۔ امیر تیمور کے آباؤ اجداد گھوڑے پر پیدا ہوئے اور اسی پر فوت ہوئے۔ صرف شادی کے لیے گھوڑے سے اترتے۔ ہمارے ہاں تو شادی کے لیے گھوڑے پر چڑھتے ہیں۔ رائٹرز یونین کے جنرل سیکرٹری اور ازبکستان کے عوامی ادیب عبداللہ عارف نے بتایا کہ آزادی نے ہمیں زبان ہی نہیں لوٹائی ہمارا ادب اور ہمارے ہیروز بھی ہمیں لوٹائے ہیں۔ پہلے امیر تیمور کا نام لینا منع تھا۔ ہماری زبان میں لوہے کے لیے لفظ تمور ہے لیکن ہم تمور لکھتے نہ بولتے کہ کہیں اس سے مراد تیمور لے کر ہمیں پکڑ نہ لیا جائے۔ ہمیں امیر تیمور کے بارے میں اتنا ہی علم ہے کہ وہ میرزا ادیب کی طرح چلتے اور میرزا ادیب آ رہے ہوں تو انہیں دور سے دیکھ کر کتے بھاگ جاتے ہیں کیونکہ ان کی چال سے لگتا ہے وہ چلتے ہوئے مارنے کے لیے پتھر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ علی شیر نوائی ازبکوں کے قومی شاعر ہیں۔ ہمارے قومی شاعر علامہ اقبال کو تو قوالوں نے تالیوں سے پیٹ دیا لیکن علی شیر نوائی کو قدرت نے قوم سے بچانے کے لیے یہ کیا کہ جب علی شیر نوائی کی پانچ سویں سالگرہ منانے کا پروگرام تھا تو ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا۔ 25 سال بعد پانچ سو پچیسویں سالگرہ کے جشن کا اہتمام کیا جا رہا تھا تو تاشقند میں زلزلہ آ گیا اور پورا شہر غائب ہو گیا۔ 1991ء میں اس کی 550 ویں سالگرہ کا جشن منایا گیا تو روس کا شیرازہ بکھر گیا۔ اس لیے آج کی ازبک امیر تیمور کو منانے کی کوششوں میں ہیں۔ کہتے ہیں ایک بار ایک اندھی عورت جس کا نام محبت خانم تھا تیمور کے پاس لائی گئی۔ تیمور نے کہا "سنا ہے محبت اندھی ہوتی ہے" تو وہ بولی "اندھی نہ ہوتی تو لنگڑے کے پاس کیوں آتی؟" تیمور کا ہر جملہ 'جملہ تیموریہ' ہوتا یعنی لنگڑا اور حملہ اور۔ امیر تیمور نے وہاں 35 سال حکومت کی وہ دنیا میں جو دیکھتا ویسا ہی سمرقند میں آ کر بنواتا۔ ایک ملک میں اس نے خوبصورت بادل دیکھا تو وزیروں سے کہا "سمرقند میں ایسا بادل ہونا چاہیے۔" سندھی کہاوت ہے ایک ٹانگ والوں کے دیس میں جاؤ تو اپنی ایک ٹانگ کاندھے پر رکھ لو "کانوں" کے دیس میں جاؤ تو ایک آنکھ بند کر لو' البتہ اندھوں کے دیس میں جاؤ تو دونوں آنکھیں کھلی رکھو۔ ہمیں ازبکستان کی معیشت تیمور کی

طرح چلتی نظر آئی۔ ہم امیر تیمور کا مجسمہ دیکھ رہے تھے تو ایک گائیڈ بولا "یہ امیر تیمور ہے آج کل جو اس آزاد ملک میں دیکھ رہے ہو اسی کی بدولت ہے" تو پاس کھڑا ایک ازبک بولا "سارا الزام ایک شخص کے سر ڈال دینا زیادتی ہے" وہ اسے امیر تیمور لنگ گورکان کہتے ہیں۔ شاید گورکان اس لیے کہتے ہیں کہ اس زمانے میں گورکن اسے اپنی ہی برادری کا بندہ سمجھتے تھے۔ امیر تیمور کا مزار سمرقند میں ہے۔ مزار کے ساتھ یوں گھر بنے ہیں کہ لگتا ہے انہیں پتہ ہی نہیں تھا کہ پاس کون دفن ہے ورنہ وہ احترامًا نہ سہی احتیاطًا ہی گھر ذرا فاصلے پر بناتے۔ ہمیں پتہ چلا ازبکستان میں ایک قبائلی علاقہ ایسا ہے جس کا نام کراکل پاکستان ہے وہاں مہمان کے آنے پر دنبہ ذبح کر کے مہمان کو دنبے کی زبان کھلاتے ہیں جب تک وہ کھا نہ لے اسے گھر سے نہیں نکلنے دیتے۔ بیویوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہیں جو پاکستانی کرتے ہیں۔

تیمور لنگ کے مقبرے کے بعد ہم شاہ زندہ قبرستان گئے اس کی سیڑھیوں کے بارے میں روایت ہے کہ چڑھتے ہوئے گنیں اور پھر اترتے ہوئے گنیں اور اگر دونوں مرتبہ ایک جتنی نہ ہوں تو اس کا مطلب ہے آپ گناہ گار بندے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی صاحب سیڑھیاں اترتے وقت سب سے زیادہ توجہ اور محنت سے سیڑھیاں گن رہے تھے۔ آخر ان کی محنت رنگ لائی اور سیڑھیاں برابر ہو گئیں۔ روسی انقلاب کے بعد سے اس قبرستان میں قبروں پر مردوں کی تصویریں لگانے کا رواج ہوا ہے جو سنگ مرمر کی بڑی بڑی سلوں پر منقش ہوتیں۔ ہمارے کالموں میں کالم نگار اکثر اپنی جوانی کی تصویر لگاتے ہیں۔ قبروں کی تصویریں دیکھ کر یوں لگا کہ یا تو یہ لوگ نوجوانی میں مرتے ہیں یا ہم کالم نگاروں سے بہت متاثر ہیں۔ وہاں کے ایک اخبار میں برائے فروخت کے کالم میں ایک خبر تھی "ایک سیکنڈ ہینڈ کتبہ بہت سستا بیچا جا رہا ہے ایسے حضرات کے لیے نادر موقع جن کا نام ساتوف ہو' اصل مالک ازبکستان چھوڑ کر روس جا رہا ہے۔" ازبک اپنے ہیروز سے اس قدر محبت کرتے ہیں کہ اگر لینن کا مقبرہ ازبکستان میں ہوتا تو وہ کتبے سے لینن کا نام مٹا کر اس پر امیر تیمور لکھ دیتے۔

سراسر گذشت

میراجی نے کہا ہے "کتابیں تین طرح کی ہوتی ہیں۔ کتابوں کی ایک قسم وہ ہے جنہیں ہم لکھتے ہیں اور دوسرے پڑھتے ہیں۔ یہ ہماری بیٹیاں ہوتی ہیں۔ دوسری قسم کو ہم گھروں پر اونچی جگہوں پر طاق میں' جزدانوں میں لپیٹ کر اور سجا کر الگ رکھ دیتے ہیں' یہ ہماری بزرگ ہوتی ہیں۔ کتابوں کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جسے دوسرے لکھتے ہیں اور ہم پڑھتے ہیں' یہ ہماری بیویاں ہوتی ہیں۔ پروین عاطف کی کتاب "ٹپر واسنی" ہمیں بیوی نہیں لگی کیونکہ یہ تو

بڑی دلچسپ ہے۔ اگر بیوی ہے بھی تو کسی اور کی جسے موقع ملنے پر پڑھ لیا جائے تو اس پر تبصرہ ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ کسی سیانے کا قول ہے' تبصرہ لکھنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لیں کہ مصنف کے ہاتھ آپ کے تبصرے سے لمبے تو نہیں۔ ہم تو اس لیے بھی کتابوں پر تبصرہ نہیں لکھتے کہ اس کے لیے پہلے کتاب پڑھنا پڑتی ہے اور ہم کسی کتاب کو پڑھ لیں تو اس پر اچھا تبصرہ نہیں لکھ سکتے۔ تبصرہ لکھنے میں ہمیں یہ دشواری ہے کہ ساقی فاروقی کی طرح ہمارے پاس کتا نہیں ہے۔ وزیر آغا صاحب جب لندن گئے تو ساقی کے خونخوار کتے کو دیکھ کر ڈر گئے' تو ساقی بولے: "آپ یونہی گھبرا رہے ہیں۔ یہ صرف بڑے شاعروں پر بھونکتا ہے۔ احمد فراز آئے تو یہ چپ نہ ہوتا تھا۔" ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں میں نے دل میں کہا: "اگر یہ کتا واقعی سخن شناس ہوتا تو وہ دن رات ساقی کے گھر میں رہتے ہوئے کیوں نہ بھونکتا۔" ہمارے ہاں یہ کام نقاد ہی کرتے ہیں۔ البتہ یہ ہے کہ اگر تبصرہ لکھتے وقت بہت غصہ آئے تو تبصرہ نگار کو چاہیے' کتا لے کر باہر سیر کو نکل جائے۔ واپس آنے تک اس کا غصہ ختم ہو چکا ہو گا۔ نقاد بھی تخلیق کار ہوتا ہے۔ رائٹر ادب تخلیق کرتا ہے تو نقاد اس کی خامیاں۔

ہم بھارت سے آلو' جاپان سے ہائیکو اور دوسرے ملکوں سے سفرنامے درآمد کرتے ہیں۔ سفرنامے سرگذشت کا فارن ایڈیشن ہوتے ہیں بلکہ سراسر سرگذشت ہوتے ہیں۔ ٹپر اسنی پروین عاطف کا ایک سفرنامہ ہے جس میں مصنفہ کے ساتھ ساتھ پڑھنے والا بھی "سفر" کرتا ہے۔ اس کتاب کی ایک خوبی یہ ہے کہ پڑھنے والے کو جلد ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ ایک سفرنامہ ہے' ورنہ ہم نے جون ایلیا کی پوری کتاب اس لیے پڑھی تاکہ جان سکیں کہ یہ کس چیز کی ہے؟ آخر جا کے شاعری کی نکلی۔ تاخیر و تجغیر کے شاعر جون ایلیا کو ہم نے جس ماہ بھی دیکھا' ہمیں وہ جون ہی لگا۔ ان کی زندگی کا پہلا شعر ہے؎

چاہ میں اس کی طمانچے کھائے ہیں
دیکھ لے سرخی میرے رخسار کی

اپنے شعر پر خود ہی اپنے آپ کو پیٹتے ہیں' جس سے اندازہ لگا لیں' ان کا شعری ذوق کتنا بلند ہے۔ اجمل نیازی اپنے حلیے سے کئی مذہبوں کی نمائندگی کرتے ہیں جب کہ جون ایلیا اور پروین عاطف کئی جنسوں کی۔ ٹپر واسنی پڑھ کر لگتا ہے' دوران سفر دو تین مرتبہ تو پروین

کو بھی خاتون سمجھا گیا' جب کہ امریکہ میں تو جون ایلیا صاحب کو ایک اہلکار نے باتھ روم میں گھسنے سے روک دیا تھا کہ خواتین کا باتھ روم دوسری طرف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں' جون ایلیا کو ان کے لمبے بالوں کی وجہ سے خاتون سمجھا گیا۔ کچھ کے نزدیک زاہدہ حنا سے شادی کرنے کی وجہ سے۔ جون ایلیا ایسے شاعر گھرانے میں پیدا ہوئے کہ ان کے پیدا ہونے پر والد نے پوچھا: "نومولود وزن میں تو ہے؟" اب تو پہلی ہی نظر میں وزن سے گرے ہوئے لگتے ہیں۔ پروین عاطف کے گھر کی فضاء ایسی ادبی تھی کہ بات یہ ہو رہی ہوتی کہ رات کو کیا پکے گا تو سننے والے کو لگتا کہ کوئی ادبی مذاکرہ ہو رہا ہے۔ پروین نے ادب میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ ان خواتین میں سے ہیں جنہیں ایک بار دیکھو تو ایک بار ہی نظر آتی ہیں۔ دیکھنے میں وہ پروین عاطف کی ملازمہ لگتی ہیں۔ مردوں کے ساتھ مردوں کی طرح ملتی ہیں۔ کسی کو پریشان نہیں دیکھ سکتی' اس لیے بہت کم آئینہ دیکھتی ہیں۔ دوسروں کی خوشی' غمی میں خود کو اس قدر انوالو کر لیتی ہیں کہ شادی کسی کی ہوتی ہے' شرمایہ رہی ہوتی ہیں۔ عزت کسی کی لٹتی ہے' شرم سے کئی دن یہ گھر سے نہیں نکلتی۔ جب لکھتی ہے تو دوسروں کو دکھا دکھا کر کہتی ہے' کوشش کی ہے: "دیکھنا بات بنی بھی ہے یا نہیں۔" پہلے بچے کی پیدائش پر بھی یہی کہا تھا۔ پروین عاطف کی وہ تخلیقات جو خواتین میں زیادہ مشہور ہوئیں' ان میں ٹیر وانسی اور ظل عاطف قابل ذکر ہیں۔ لگتا ہے' پروین عاطف کی کتاب کی کاپی جوڑنے والا ان کا فین تھا۔ اس لیے اس نے اسے اپنی پسند کی ترتیب سے جوڑا یعنی جو صفحہ زیادہ دلچسپ لگا' اسے پہلے جوڑ دیا۔ کئی سو کتابیں بکنے کے باوجود کسی قاری نے شکایت نہیں کی۔ اس سے اندازہ لگالیں کہ پروین عاطف کے قارئین اسے کتنا سمجھتے ہیں۔ شکر ہے گیلیلیو اردو کا سفرنامہ نگار نہیں تھا' ورنہ لکھتا: "دنیا میرے گرد گھومتی ہے۔" پروین عاطف مانتی ہیں' دنیا میری بجائے سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کا سفرنامہ پڑھنے کے بعد ہمیں بھی دنیا گھومتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے سفرنامے میں دو یا تین افسانے یوں چھپائے ہیں کہ انہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے بندہ پوری کتاب پڑھ جاتا ہے۔

سربرہنانِ مملکت

روس کے ایک میگزین میں ایک تازہ ترین تحقیق چھپی ہے۔ جس میں یہ انکشاف ہے کہ ہر دوسرا روسی حکمران گنجا ہوتا ہے۔ مثلاً لینن گنجے تھے' مگر ان کے جانشین جوزف سٹالن کے سر پر گھنے بال تھے۔ خرد شیف گنجے تھے' مگر ان کے بعد آنے والا برژنیف ان سا ہم سرنہ تھا' بالوں والا تھا۔ اندروپوف گنجے تھے' مگر ان کے جانشین چرنینکوف کے سر پر سفید بال تھے۔ گورباچوف گنجے تھے' مگر بورس یلسن کے سر پر بال ہیں۔ سو آئندہ روسی صدر گنجا ہوگا۔

ہم یہی سمجھتے رہے کہ صرف ہمارے ہاں ہی حکمران بننے کے لیے "گنج" چاہیے۔ ویسے تو عوام کے سر گننے کے لیے ہوتے ہیں اور حکمران کے سر بالوں کے لیے' لیکن روس کے نئے سربراہ کا سر باہر سے بھی خالی ہوگا۔ ہمیں کشتی رانی اور حکم رانی کا شوق نہیں کہ ان میں ڈوب مرنے کے بڑے مواقع ہیں۔ ہمارے نزدیک حکمران کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ حکمران ہوتا ہے۔ اس کا پہلا قانون رعایا سے اپنی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ حکمران اور الجبرا ہمیں کبھی سمجھ نہ آسکا۔ ہمیں تو کئی بار توزک جہانگیری پڑھنے کے باوجود یہ سمجھ نہ آسکی کہ جہانگیر جس اونٹنی کا دودھ پیتا تھا' اسے روز چار سیر گائے کا دودھ کیوں پلاتا تھا؟ خیر بادشاہوں کے کام کاموں کے بادشاہ ہوتے ہیں۔ ہم تو صدری کو عرصہ تک صدر کا لباس سمجھتے تھے۔ اس سے اندازہ لگالیں' ہم صدر کو کتنا سمجھتے ہیں۔

بہر حال اس تحقیق کے بعد روس میں کئی گنجے رہنما سر اٹھانے لگے ہیں۔ کلیوں نے تو گنج کی وگیں پہننا بھی شروع کر دی ہیں۔ اس سے قبل تو وہ بھی ہماری طرح اپنا گنج ٹوپی اور ٹیکس سے چھپا کر رکھتے۔ البتہ گنجوں کو یہ فائدہ تھا کہ انہیں کنگھی نہ خریدنا پڑتی اور بال گرنے کا بھی ڈر نہ ہوتا۔ وہ شخص جس کے آگے بڑے بڑے سر جھکاتے ہیں' اسے حجام کہتے ہیں۔ جو اس کے آگے سر نہ جھکائے' اسے گنجا کہتے ہیں۔ ہم "سر" پرست قسم کے لوگ ہیں۔ کئی حجاموں کا بزنس ہمارے سر پر چل رہا ہے۔ پھر بھی ہم سمجھتے ہیں' سکھ مذہب کی بنیاد ہی کسی نے حجاموں سے تنگ آکر رکھی تھی۔ گنجے ان مسائل سے بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ اس قدر سر بلند ہوتے ہیں کہ ان کا سر ان کے بالوں سے بھی بلند ہو چکا ہوتا ہے۔ اس تحقیق سے پہلے ہمارا خیال تھا کہ پاکستانی بوڑھوں کی آخری آرام گاہ مسجد اور روسی بوڑھوں کی حکومت ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو ویگن اور بوڑھے خدا خدا کرنے کے لیے ہیں۔ وہاں لیڈر بوڑھے ہو جائیں تو انہیں ایوان صدر میں چن دیا جاتا ہے۔ گورباچوف جب پولٹ بیورو کے رکن بنے تو ساٹھ سال کے تھے۔ دوسرے ممبران کے حساب سے ان کی عمر اتنی کم تھی کہ سب انہیں بچہ سمجھ کر بولنے نہ دیتے۔ یہ وہی گورباچوف ہیں جنہیں نوجوانی میں انٹرویو کے دوران کسی نے پوچھا: "شادی شدہ؟" تو وہ بولے: "جی نہیں۔ میرے ماتھے پر یہ نشان پیدائشی ہے۔" وہ تو خیر کبھی بوڑھے نہ ہوں گے کیونکہ ہر بوڑھا ان سے پندرہ سال بڑا ہے۔ برژنیف جب صدر بنے'

تب ان کے لیے خود چلنا ملک چلانے سے زیادہ مشکل تھا۔ یادداشت ایسی تھی کہ ایک تقریب میں وہ غیر ملکی مہمان کا نام بھول گئے اور اپنی سیکرٹری کو قریب بلا کر پوچھا: "ان کا نام کیا ہے؟" اس نے بتایا: "ان کا نام ڈیسائی اور آپ کا برژنیف ہے۔" پہلے ماسکو کو چھینک آتی تو دنیا کو نزلہ لگ جاتا۔ اب تو کلنٹن کو نزلہ ہو تو ماسکو چھینکنے لگتا ہے۔ وہاں اب جمہوریت کا دور دورہ ہے۔ 1995ء میں روسی ٹی وی پر ایک مذاکرہ ہوا' جسے دیکھنے والوں نے مذاکرا کہا۔ اس میں انتہا پسند سیاست دان زرینوسکی نے اپنا شراب کا گلاس مخالف سیاست دان کے منہ پر انڈیل دیا' جس نے اس کے ساتھ بھی یہی کچھ کیا۔ یہ منظر لاکھوں روسیوں نے دیکھا کیونکہ یہ پروگرام براہ راست دکھایا جا رہا تھا۔ مباحثے کے میزبان نے اس دوران معزز سیاست دانوں کو گھونسے بھی رسید کیے۔ ماسکو ٹی وی پر ہونے والے اس مذاکرے کا موضوع تھا: "جمہوریت میں شخصی آزادی۔"

وکیلوں کی جائیداد اور سیاست دانوں کی جائے داد بے وقوفوں کے سر پر بنتی ہے۔ ویسے اگر بے وقوف نہ ہوتے تو دنیا اب تک تباہ ہو چکی ہوتی۔ ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارے جتنے اچھے رہنما ہیں' سب مردہ ہیں اور جتنے برے حکمران ہیں' سب سابق ہیں۔ کیونکہ موجودہ حکمران برا نہیں ہوتا۔ اسے یہ کہو تو برا ہوتا ہے۔ ہمیں اپنے سیاست دانوں کی نیت پر شک رہتا ہے ویسے انہوں نے یہ شہرت دن رات کی محنت سے حاصل کی اور اپنی اس شہرت کو قائم رکھنے کے لیے بھی انہیں دن رات محنت کرنا پڑتی ہے۔ الیکشن سے پہلے ایک رہنما نے کہا: "اس بار ہماری پارٹی دیانت دار امیدوار کھڑا کرے گی۔" تو ایک صحافی بولا: "اس بار آپ کو کھڑا ہونا چاہیے تھا۔" بہر حال ہمیں یہ روسی تحقیق وہاں کی عورتوں کے خلاف سازش لگتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق دنیا کی سب سے وفادار عورتیں جاپانی اور سب سے محنتی روسی ہوتی ہیں۔ جاپانی تو خیر اس لیے وفادار ہیں کہ وہ اس قدر مصروف ہوتی ہیں کہ ان کے پاس بے وفائی کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوتا۔ البتہ روسی عورتیں محنت کرنے کی اتنی عادی ہوتی ہیں کہ سرکاری دفتروں میں انہیں بہت مشکل پیش آتی ہے' لیکن وہ روسی صدر نہیں بن سکتیں کیونکہ وہ اتنا بڑا گنج کہاں سے لائیں گی۔

ہو سکتا ہے یہ بورس یلسن کو صدر بننے سے روکنے کے سلسلے کی کڑی ہو۔ ویسے اس

تحقیق کے حساب سے تو بورس یلسن پیدائشی صدر ہیں' یعنی جب وہ پیدا ہوئے تو ان کے سر پر بال نہ تھے۔ بچپن میں انہیں ناخن کاٹنے کی عادت تھی' اب نہیں۔ کیونکہ انہوں نے سارے ناخن کاٹ لیے ہیں۔ روس وہ ملک ہے جہاں بندہ شراب پینے سے انکار کردے تو دوسرا سمجھتا ہے' یہ نشے میں ہے۔ یلسن اس حالت میں روس کی حکومت یوں چلا رہے ہیں جیسے ویگن چلا رہے ہوں۔ ماسکو کو اکثر بڑی بڑی پریشانیاں رہتی ہیں' جن میں سے ایک یہ جاننا ہے کہ اسے کون کون سی پریشانیاں ہیں۔ وہ افسانے جنہیں افسانہ نگار کی بجائے مورخ لکھتے ہیں' انہیں تاریخ کہتے ہیں۔ دنیا میں یلسن کے جتنے افسانے مشہور ہیں' اتنے کسی افسانہ نگار کے نہ ہوں گے۔ خواتین کے مسائل تو وہ "چٹکیوں" میں حل کر دیتے ہیں۔ ہمارے خیال میں بورس یلسن کو اپنے علاوہ کسی اور کو صدارتی امیدوار سے کوئی خطرہ نہیں' لیکن اسے پھر بھی گنجوں سے محتاط رہنا چاہیے کیونکہ گنجوں کا کوئی بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

دیوارِ خواتین

امریکی محققین کے کیا کہنے' انہوں نے دو سال قبل بڑی تحقیق کے بعد کہا تھا کہ کولمبس مرد تھا۔ حالانکہ ہم نے شروع میں ہی کہہ دیا تھا کہ اگر کولمبس مرد نہ ہوتا تو وہ امریکہ دریافت نہ کرتا۔ بلکہ وہ امریکہ دریافت کرتی۔ اس برس امریکیوں نے تحقیق کے بعد بتایا کہ صدر بش جب اپنے دور حکومت میں تیسری دنیا کے ایک ملک کے دورے پر گئے تو اس ملک نے اکیس توپیں داغی تھیں اور اتفاق سے ایک بھی گولہ نشانے پر نہ لگا تھا۔ تحقیق کا جذبہ

امریکیوں میں اس قدر ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد سب سے پہلے اپنے سرکاری والد کو تحقیق و تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ایک فرانسیسی رائٹر نے کہا: "کسی امریکی کے پاس چند ماہ کے لیے کرنے کو کچھ نہ ہو تو وہ یہ وقت اس تحقیق میں لگا دے گا کہ اس کا دادا کون تھا۔" یہ سن کر مارک ٹوئن بولے: "اگر کسی فرانسیسی کے پاس اتنا وقت ہو تو وہ اسے دادا کی بجائے اپنے والد پر لگائے گا۔" بہرحال امریکیوں نے تازہ ترین انکشاف کیا ہے کہ مارکوپولو چین قبلائی خان کے دربار میں گیا ہی نہیں تھا' بلکہ اس نے گھر بیٹھ کر یہ سفرنامے لکھے تھے۔ اس انکشاف کے بعد ہمیں لگا کہ کہیں وہ یہ نہ کہہ دیں کہ مارکوپولو پاکستانی سفرنامہ نگار تھا لیکن انہوں نے وجہ یہ بتائی کہ اس نے اپنے سفرنامے میں چائے' دیوار چین اور غریبی کا ذکر نہیں کیا۔ مارکوپولو نے چائے کا شاید اس لیے ذکر نہ کیا ہو کہ اسے لسی پسند ہو اور دیوار چین کا ذکر اس لیے نہ کیا ہو کہ وہ سفرنامے میں صرف بڑی بڑی چیزوں کا ذکر کرنا چاہتا ہو۔ اسے وہاں غریبی نظر نہ آنے کی وجہ البتہ طبی ہے کہ ان دنوں نظر کی عینکیں دستیاب نہ تھیں۔ ہمارے ہاں تحقیق بھی یوں کرتے ہیں جیسے تفتیش کر رہے ہوں۔ اب تو کچھ حضرت لوگ اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ ادبی ڈاکٹروں میں سے کس کس نے خود تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی۔ ایک محقق نے بتایا کہ ساغر صدیقی صاحب کو پانی بہت گیلا لگتا تھا۔ سو وہ ٹونٹی بند کر کے نہاتے تھے۔ پروفیسر حافظ آبادی صاحب نے اپنی تحقیق سے ثابت کیا کہ پروفیسر حضرات غیر حاضر دماغ ہوتے ہیں کیونکہ موصوف خود تحقیق کرتے کرتے اس بات کو یکسر بھول گئے کہ وہ کس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں۔ مغربی محققوں نے تو کھنگال کھنگال کر شیکسپیئر کو کنگال کر دیا۔ اب تو انہیں شیکسپیئر کی کوئی کہانی ایسی ملے جو انہیں پہلے کسی مصنف کی کتاب میں نہ ملی ہو تو وہ نہایت دلجمعی سے تحقیقات جاری رکھتے ہیں' کیونکہ انہیں یقین ہوتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اصل کہانی مل جائے گی۔ ہمارے ایک مزاح نگار دوست بولے: "مرنے کے بعد میں جنت میں شیکسپیئر سے یہ ضرور پوچھوں گا کہ اس کے نام سے جو ڈرامے منسوب ہیں' عام خیال ہے کہ وہ اس نے نہیں لکھے۔" عرض کیا: "اگر شیکسپیئر جنت میں نہ ہوا تو؟" بولے: "پھر نقاد خود ہی اس سے پوچھ لیں گے۔" ڈپلومیٹ اور محقق کو دھوکا دینا آسان ہے۔ آپ اسے سچ سچ بتا دیں' وہ سمجھے گا' آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ سب سچ سچ لکھ دینا تو محقق کی روزی پر لات مارنا

ہے۔ آٹو موبائل اور آٹو بائیو گرافی میں ذرا سی بے احتیاطی عمر بھر کا پچھتاوا بن جاتی ہے۔ خود نوشت کے بارے میں ہماری تو یہی رائے ہے کہ اس میں صرف ایک ہی خامی ہوتی ہے' وہ ہے ناقص موضوع کا انتخاب۔ سفرنامہ مصنف کی آپ بیتی کا فارن ایڈیشن ہوتا ہے۔ اس میں وہ سب ہوتا ہے جو مصنف چاہتا ہے کہ کاش ہوا ہوتا۔ اگرچہ ان ساری خواہشوں کی تکمیل کے لیے آپ بیتی موجود ہے' لیکن اس میں یہ مسئلہ آ جاتا ہے کہ مقامی جھوٹ جلد رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ اکثر سفرنامے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر بندہ ان پر اعتبار کر لے تو پھر سفرنامہ نگار پر اعتبار نہیں رہتا۔ یوں تو اب ایسا دور ہے کہ پہلے انسان دوسرے سے پوچھتا: "آپ بھوتوں پر یقین رکھتے ہیں؟" اب بھوت دوسرے سے پوچھتا ہے: "آپ انسانوں پر یقین رکھتے ہیں؟" شکر ہے محققین نے یہ نہیں کہا کہ مارکوپولو نے سفرنامہ لکھا ہی نہیں۔

ہمیں مارکوپولو اور پولو پسند ہیں۔ پولو واحد گیم ہے جس میں بندہ اکیلا کھیل کر بھی خود سے ہار سکتا ہے۔ مارکوپولو کے سفرناموں کو دیوار چین کے نہ ہونے نے مشکوک بنایا ہے۔ ہمارے سفرنامہ نگاروں کے سفرناموں کو دیوار خواتین کے ہونے نے۔ یوسف کمبل پوش سے یوسف ثانی ٹی وی پوش تک کے سفرناموں میں دیوار خواتین ملتی ہے' جس میں ملک سے نکلتے ہی مصنف چنا جاتا ہے۔ لگتا ہے ہمارے سفرنامہ نگار جہاں جاتے ہیں' وہاں کے مردوں کو پہلے ہی پتہ چل جاتا ہے اور وہ کہیں اور چلے جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں ہر طرف عورتیں ملتی ہیں۔ ہم مانتے ہیں۔ ایک مرد بیک وقت سینکڑوں لڑکیوں سے محبت کر سکتا ہے بشرطیکہ ان میں سے کوئی بھی اس میں دلچسپی نہ لے۔ شاعری میں عورتوں سے باتیں کرنا غزل اور نثر میں ان سے باتیں کرنا سفرنامہ کہلاتا ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کو سب سے زیادہ وہ سفرنامہ پسند آتا ہے جو مصنف کی بیوی کو ناپسند ہو۔ مقامی مارکوپولو اس لیے بچے ہوئے ہیں کیونکہ ان کی کتابیں ریڈر پروف ہیں' بالخصوص امریکی محققوں سے۔ جیسے مرحوم عظیم قریشی صاحب نے اپنا شاعری کا مجموعہ پنڈت نہرو' برنارڈشا اور چرچل کو بھیجا تو انتظار حسین نے انتظار کیے بغیر کہا: "پنڈت نہرو تو چلو ہوئے مگر برناڈشا اور چرچل تو شاید اردو نہیں جانتے۔" تو عظیم قریشی بولے: "اگر عظیم قریشی کے کلام کا نہیں مطالعہ کرنا ہے تو پھر ان دونوں کو اردو سیکھنا پڑے گی۔"

نعلین، در بغلین

یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہاری باجپائی دراصل ہاری باجپائی ہے، پھر بھی ہمارا دل چاہتا ہے وہ کسی طرح اعتماد کا ووٹ لے ہی لیں۔ چاہے باجپائی 'بیاج پائی' ہو جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں باجپائی سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ ہمیں تو بھارتی جنتا پارٹی کے 64 سالہ رکن جواہر سنگھ سے ہمدردی ہے جس نے تیس سال پہلے قسم کھائی تھی کہ اس وقت تک ننگے پاؤں رہے گا جب تک باجپائی ملک کے وزیر اعظم نہیں بن جاتے اور جواہر سنگھ نے ابھی کل ہی

جوتے خریدے ہیں۔ اگر باجپائی وزیر اعظم نہ رہے تو ان جوتوں کا کیا مصرف رہ جائے گا۔ ہم تو چاہتے ہیں، باجپائی حکومت اور جواہر سنگھ کے جوتے کئی سال چلیں۔

سیاست اور جوتوں کا بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایک بار ابن انشاء بازار میں جوتے خریدنے گئے۔ جوتے پسند آگئے مگر کہا: "یکم کے بعد خریدوں گا۔" تو دکاندار بولا: "یکم کے بعد نہیں ملیں گے کیونکہ یکم سے سیاسی سرگرمیوں سے پابندی اٹھائی جا رہی ہے۔" جواہر سنگھ نے 30 سال قبل اٹل بہاری باجپائی کے لیے جوتے اتارے تھے، تب سے ان کے نعلین در بغلین ہیں۔ اسے ننگے پاؤں دیکھ کر دوسری پارٹیوں کے کارکن جوتے اتار لیتے ہیں۔ جوتا بھارت میں پہننے کے علاوہ بھی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔ غالب سے کسی نے پوچھا: "جوتا مذکر ہے یا مونث؟" تو غالب نے کہا: "اگر زور سے لگے تو مذکر، اگر آہستہ لگے تو مونث۔" ویسے اگر جوتے مونث ہوتے تو اٹل بہاری باجپائی خود بھی ننگے پاؤں ہی ہوتے۔ سنا ہے ان کے جوتے بہت چلتے ہیں جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ ابھی کنوارے ہیں اور کنواروں کے جوتے صرف پہننے کے لیے ہی استعمال ہوتے ہیں۔ شادی انہوں نے ابھی تک شاید اس لیے نہیں کی کہ وہ کوئی کام جلد بازی میں نہیں کرتے، سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور جو شادی نہیں کرتے، وہ یہ سوچ سمجھ کر ہی کرتے ہیں۔ سارے خاوند اور سیاست دان ایک سے ہی ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں الو میں یہ خوبی ہے کہ ایک الو دیکھ لو تو سمجھ لو سب دیکھ لیے۔ سیاستدانوں میں اس کے علاوہ اور بھی کوئی خوبیاں ہوتی ہیں۔ جنتا دل کے صدر اور سیاست بہار کے وزیر اعظم لالو پرشاد یادو نے کہا ہے "ہم اٹل بہاری باجپائی کے مقابلے میں بہتر وزیر اعظم نہیں ہو سکتے، کیونکہ ہم شادی شدہ ہیں اور وہ غیر شادی شدہ۔" حالانکہ ہم سمجھتے ہیں شادی شدہ زیادہ ذمہ دار ہوتے ہیں جیسے آصف زرداری صاحب میں ساری اچھے خاوندوں والی خوبیاں ہیں، یعنی کھانا بہت اچھا پکاتے ہیں، سنتے بھی بہت اچھا ہیں، برتن تو اتنے صاف دھوتے ہیں کہ بھارتی پریس انہیں مسٹر کلین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ فرائیڈ سے کسی نے پوچھا: "دنیا میں کتنے فیصد خواتین اور مرد شادی کے خواہش مند ہیں؟" فرائیڈ نے کہا: "ننانوے فیصد۔" پوچھنے والے نے کہا: "اور ایک فیصد؟" فرائیڈ بولا: "جھوٹ بولتے ہیں۔" ویسے کنواروں کو بھی حکومت ملتی ہے تو وہ بھی اس کے ساتھ جو سلوک کرتے ہیں اس سے شادی شدہ ہی لگتے ہیں۔ ایک

بندہ جس کی جب تک شادی نہ ہو‘ وہ خود کو کنوارہ کہتا ہے۔ شادی کے بعد وہ خود کو جو کہتا ہے‘ وہ سننے سے تعلق رکھتا ہے۔ اداکارائیں تو فن سے شادی کر لیتی ہیں‘ جس کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ طلاق کی صورت میں بچے لینے کے لیے عدالت میں جانا نہیں پڑتا۔ باجپائی کو سیاست سے شادی کرنے کا یہ فائدہ ہوا کہ آج بی جے پی امید سے ہے۔ کہتے ہیں باجپائی کے وزیراعظم بنتے ہی دکانوں سے جوتے غائب ہو گئے ہیں۔ آئزن ہاور جب امریکہ کا صدر منتخب ہوا تو اسے ملک بھر سے بے شمار تحفے موصول ہوئے‘ ان میں ایک جھاڑو بھی تھی۔ بھیجنے والے نے ایک رقعہ بھی ساتھ بھیجا تھا‘ جس میں لکھا تھا: ”آپ نے اپنی تقریروں میں ملک کا گند مکانے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے یقین ہے میرا یہ تحفہ آپ کو اپنے وعدے کی یاد دلاتا رہے گا۔“ لوگ آج کل جواہر سنگھ کے پاؤں میں جوتا دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں کہ باجپائی ابھی تک بھارت کے وزیراعظم ہیں۔ ایک دن جواہر سنگھ نے تھوڑی دیر کے لیے جوتا اتارا تو لوگ یوں گھبرا گئے جیسے وزیراعظم اتار دیا ہے۔ جب رام کو بن باس ملا تو اس کے بھائی نے بھی رام کے پاؤں سے جوتے اتروا لیے تھے تاکہ جب بھائی کی یاد آئے تو انہیں دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کر لیا کرے۔ بھارت کی دوسری پارٹیوں کے کارکن بھی اپنی پسند کی لیڈر کی آؤ بھگت کے لیے احتراماً جوتا اتار لیتے ہیں۔ لیڈر ناپسند ہو تب بھی اس کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں کچھ لوگ اتنے نیک ہیں کہ وہ جوتے تک لینے کے لیے مسجد جاتے ہیں۔ بی جے پی کی وجہ سے بھارتی مسلمانوں کے تو گھر بھی مسجدیں لگتے ہیں‘ یعنی ساز و سامان سے خالی۔ باجپائی صاحب پارٹی میٹنگز میں تقریر کرنے سے پہلے جوتے اتار لیتے ہیں۔ ایسے مقرر ہیں کہ ایک بار تقریر کے دوران مائیکروفون خراب ہوا تو انہوں نے آواز بلند کرتے ہوئے آخری قطار میں بیٹھے ایک شخص سے دریافت کیا: ”کیا میری آواز سن سکتے ہو؟“ اس شخص نے جواب دیا: ”نہیں۔“ تو فوراً پہلی قطار میں بیٹھے ایک شخص نے اٹھ کر کہا: ”میں اچھی طرح سن سکتا ہوں۔ آپ یہاں آ جائیں۔ میں آپ کی جگہ بیٹھ جاتا ہوں۔“

اٹل بہاری باجپائی شاعر بھی ہیں۔ وہ اس قسم کی شاعری کرتے ہیں جیسی اس قسم کے لوگ کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ پوچھیں ’اس قسم کے لوگ کیسی شاعری کرتے ہیں؟‘ تو صاحب جیسی اٹل بہاری باجپائی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کی کتاب ان کے سیاسی حریف

نرسیما راؤ نے شائع کی کیونکہ کسی شاعر کو مارنا ہو تو اس کا مجموعہ کلام شائع کر دو۔ اگر شاعر پھر بھی زندہ رہا تو پھر اس کا مرنا مشکل ہو گا۔ نوابزادہ نصراللہ خان کی طرح انہیں شاعر کہا جائے تو برا نہیں مناتے کیونکہ سیاست دان اپنے بارے میں صرف اس الزام پر برا مناتے ہیں جس میں صداقت ہو۔

پتہ چلا ہے جواہر سنگھ کے جوتے کاٹتے ہیں لیکن وہ پھر بھی انہیں خوشی سے پہنتا ہے۔ جہاں تک جوتوں کے کاٹنے کی بات ہے تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ یہ جوتے بی جے پی کے کسی لیڈر نے دان کیے ہوں گے لیکن جواہر سنگھ اس پر بھی خوش ہے۔ شاید اس لیے کہ تنگ جوتے دنیا کی بڑی نعمت ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی اور بڑی سے بڑی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا‘ لیکن ہمیں ڈر ہے کہ اگر باجپائی اعتماد کا ووٹ نہ لے سکے تو بہت سے ”جواہروں“ کو جوتے نہ اتارنا پڑیں اور ہمیں لکھنا پڑے۔

بی جے پی آ رہی ہے ننگے پاؤں
جی میں آتا ہے کہ بڑھ کے دوں جوتا

ملکۂ افسانہ

جب سے ہم نے مسرت شاہین کا یہ بیان پڑھا ہے کہ نواز شریف چار دن کا ہیرو ہے جب کہ بے نظیر کی وزارت عظمٰی چند روزہ ہے مگر میں سدا بہار ہیروئن ہوں' تب سے ہمیں لگ رہا ہے کہ یا تو وہ نواز شریف اور بے نظیر کو نہیں جانتی یا پھر جانتی ہے۔ اس سے قبل رنگیلے نے کہا تھا کہ میں چاہوں تو صدر اور وزیر اعظم بن سکتا ہوں' لیکن صدر اور وزیر اعظم چاہیں بھی تو رنگیلا نہیں ہو سکتے۔ اگرچہ اس بیان سے یہی لگتا ہے کہ رنگیلے کو پتہ ہی نہیں' ہمارے

صدر اور وزیر اعظم کون کون رہے ہیں؟ رنگیلا بڑا وسیع صورت اداکار ہے۔ جوانی میں ایک بار اسے ایک لڑکی پسند آئی تو اس کے باپ کے پاس یہ کہنے گیا کہ اپنی لڑکی کی مجھ سے شادی کر دیں۔ اس دوران گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے مسلسل منہ کھول کر مسکرا رہا تھا کہ اس کے متوقع سسر نے اس کی حالت دیکھ کر کہا: "اپنا منہ بند رکھو تاکہ میں دیکھ تو سکوں کہ تم کون ہو؟" اس کی تو چال بھی ایسی ہے کہ دو ٹانگوں پر بھی چل رہا ہو تو یہ نہیں لگتا کہ صرف دو ٹانگوں پر چل رہا ہے۔ 1992ء میں لاہور کے ایک گرلز کالج میں مباحثہ ہوا: "اج دے سیاست داناں نالوں رنگیلا چنگا۔" گرلز کالج میں جس سوال کا جواب چار سے زیادہ لڑکیوں کا ایک دوسرے سے ملتا ہو' اسے نصابی سوال کہتے ہیں لیکن تمام لڑکیوں نے رنگیلے کو سیاست دانوں سے بہتر قرار دیا تھا۔ جس پر رنگیلے نے برا بھی منایا تھا' لیکن مسرت شاہین نے خود ہی خود کو سیاست دانوں سے مکمل بہتر قرار دے دیا ہے۔ چلو اگر نصف بہتر کہتی تو شاید کچھ سیاست دان مان ہی جاتے۔

اداکاری اور سیاست کا تب سے چولی دامن کا ساتھ ہے' جب ابھی اداکاراؤں کی چولی اور سیاست دانوں کا دامن سلامت تھا۔ ترکی کہاوت ہے: "اگر بے عیب دوست چاہتے ہو تو دوست کے عیب نہ دیکھو۔" یہی احتیاط آپ کو بے عیب سیاست دان ڈھونڈنے کے لیے کرنا ہو گی۔ آج کل تو اداکاری اور سیاست کا اتنا گہرا تعلق ہے جتنا اداکاراؤں اور سیاستدانوں کا۔ ہماری ٹریجڈی یہ ہے کہ ہمارے پاس جتنے زندہ ہیرو ہیں' سب کا تعلق فلم سے ہے۔ ہم نے تو پہلی بار جب میکلوڈ روڈ پر بابرہ کے پوسٹروں کے ساتھ نواز شریف کے رنگین تصویری پوسٹر دیکھے تھے' تو ہمیں پاکستان کے مستقبل سے زیادہ فلم انڈسٹری کا مستقبل تابناک لگا تھا۔ یہی نہیں ہماری بیشتر سیاسی خواتین نے جتنی شہرت حاصل کی' وہ خواتین کو فلموں کے ذریعے ہی مل سکتی ہے۔ ہمارے ہاں حقیقت فلمی کہانی کے بڑے قریب ہے' جس سے لگتا ہے زن' زور اور زبان فساد کی جڑ ہے۔

سیاست دانوں اور اداکاراؤں کے بارے میں اخبارات جو مرضی چھاپیں' وہ اس کا برا نہیں مناتے جب تک کہ وہ سچ نہ ہو۔ دو فلمی ستاروں کے سیکرٹری بیٹھے ایک فلم کا پریمیئر شو دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس فلم میں کام کرنے والی ہیروئن کا اور دوسرا اس فلم کے

ہیرو کا سیکرٹری تھا۔ سکرین پر دونوں کی اچھل کود دیکھ کر ایک سیکرٹری نے دوسرے سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا: "دیکھ رہے ہو ناں! اداکاری انہیں آتی نہیں' لیکن دونوں ہماری آمدنی کا اسی فیصد ہتھیا لیتے ہیں۔" ہمیں بھی اسمبلی کی کارروائی دیکھ کر یہی لگتا ہے۔ ہمیں ایک سیاستدان نے بتایا' رات کو میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا جو یوں تھا کہ وہ جو رقم خرچ کر رہا تھا' وہ اس کی اپنی تھی۔

ہیرو کا مطلب ڈکشنری میں آدھا ہوتا ہے۔ واقعی ہیرو انسان آدھا ہی ہوتا ہے۔ ہیروئن کا مطلب ڈکشنری میں ملکہ افسانہ ہے۔ اس حساب سے تو ہیروئن صرف مسرت شاہین ہی ہے کہ جتنے افسانے اس کے مشہور ہیں' اتنے تو بشریٰ رحمٰن کے نہ ہوں گے۔ ویسے بھی ادب میں جن خواتین کے افسانے مشہور ہوئے ہیں' ان میں سے بیشتر شاعرات ہیں' پھر مسرت شاہین کو تو بچپن سے ہی ہیروئن بننے کا شوق تھا۔ اس کے ٹیچر نے کہا تھا: "اگر یہ پانچ سال کی عمر تک "نابالغ" نہ ہوئی تو پھر کبھی "نابالغ" نہ ہو گی۔" وہ گھر میں ایکٹریس بننے کی ریہرسل کیا کرتی۔ پوچھا: "سب سے پہلے کیا سیکھا؟" بولی: "یہ کہ صبح گیارہ بجے تک سونا ہے؟" وہ حیرت انگیز اداکارہ ہے اور حیرت انگیز چیزوں کے بارے میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہیں دیکھ کر نئی نسل کو بالکل حیرت نہیں ہوتی۔ رقص کر رہی ہو تو لگتا ہے کہ کوئی شاہین مسرت کا اظہار کر رہا ہو۔ وہ ایک آنکھ سے اتنا دیکھ لیتی ہے جتنا دیکھنے کے لیے آنکھیں چار ہونا چاہئیں۔ اپنی کامیابیوں پر تو سبھی فخر محسوس کرتے ہیں' ناکامیوں پر فخر کرتے ہم نے اسے اور جنرل حمید گل کو ہی دیکھا ہے۔ اس سے ایج پوچھو تو کہے گی: "اٹامک ایج۔"

ہیروئن تاریخ میں ہو یا فلم میں۔ اس کے خیالات سے کہیں زیادہ لباس سے پتہ چلتا ہے' وہ کس زمانے کی ہے۔ کہتے ہیں عورتیں خاوند کو خوش رکھنے کے لیے نت نئے لباس زیب تن کرلیتی ہیں۔ حالانکہ اگر شوہروں کو ہی خوش کرنا مقصود ہوتا تو وہ اپنا ایک ایک لباس کئی کئی سال پہنتیں۔ فلموں میں مسرت شاہین کے لباس دیکھ کر زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ پہنتی ہے۔ فلموں اور تاریخ میں ہیروئن کا کام محبت کرنا ہی رہا ہے۔ فلمی ہیروئن تو یہ گھر سے سیکھ کر آتی ہے جب کہ تاریخی ہیروئن کو یہ مورخ سکھلاتا ہے۔ برطانیہ میں تو

1994ء میں لوسٹڈیز کے نام سے یونیورسٹی نے تین سالہ کورس شروع کیا ہے۔ ہزاروں طلبہ وطالبات نے اس میں داخلے کے لیے درخواستیں دیں' لیکن پچھلے سال تک صرف چند لڑکے لڑکیاں باقی بچے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ لوسٹڈیز کا تین سالہ کورس صرف تھیوری پر مشتمل تھا' پریکٹیکل ایک بھی نہ تھا۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ مسرت شاہین سدابہار ہیروئن نہیں ہے۔ وہ خود کو سدابہار ہیرو کہتی تو بھی مان لیتے لیکن اتنا پتہ ہے کہ ہیروئن کو ایکٹنگ نہ آتی ہو تو فلم انڈسٹری میں "چل" جاتی ہے۔ جیسے ایک صاحب نے کہا: "میں کئی گھنٹے پانی میں رہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے تیرنا آتا ہے۔" تو دوسرا بولا: "میں کئی سال پانی میں رہ سکتا ہوں کیونکہ مجھے تیرنا نہیں آتا۔" لیکن اگر آپ کو ایکٹنگ نہ آتی ہو تو آپ سیاست میں نہیں چل سکتے۔

مسماۃ قومی یک جہتی

خط اردو کی وہ صنف سخن ہے جس کی پہلے دن ہی نج کاری کر دی گئی تھی۔ آج بھی بہترین خط وہ مانا جاتا ہے جسے پڑھ کر پھاڑ دیا جائے۔ زمانہ بدل گیا ہے۔ اب تو شاعری میں بھی حسینوں کے خطوط سے مراد ان کے خدوخال ہی لیے جاتے ہیں۔ نئی نسل تو خطوط غالب لینے بھی ڈاک خانے جاتی ہے۔ ہم نے خود اس لیے خطوط غالب نہیں پڑھے کہ کسی کے خط پڑھنا غیر اخلاقی حرکت ہے۔ بہر حال ہم خط لکھنے والوں کو رائٹر مانتے ہیں۔ ہم تو پولیس کو بھی رائٹ

برادری میں شامل کرتے ہیں کہ شاعر لٹنے پر غزلیں لکھتے ہیں تو پولیس والے رپٹیں۔ اگر چہ فی زمانہ سب سے قیمتی رائٹر ڈاکٹر ہے جو ایک دو سطریں لکھنے کا اتنا معاوضہ لیتا ہے' جتنا منٹو صاحب کو دو کتابیں لکھنے پر بھی نہ ملتا تھا۔ کم لفظوں میں بڑی بات کہنا زیادہ لفظوں میں چھوٹی بات کہنے سے آسان ہے۔ سو ہمارے لیے غزل کی نسبت خط لکھنا زیادہ مشکل ہے۔ ویلیٹر تو ویسے بھی آرٹ کا نمونہ ہوتے ہیں کہ انہیں شروع کرنے سے پہلے بندے کو کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ اسے کیا لکھنا ہے۔ جب وہ لکھ رہا ہوتا ہے' اسے کچھ پتہ نہیں ہوتا' کیا لکھ رہا ہے ور جب ختم کرتا ہے تو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ کیا لکھا ہے۔ اس حساب سے تو ہمیں قارئین کے لو بٹر ملتے ہی رہتے ہیں جو اکثر لاجواب ہوتے ہیں اور لا...... جواب ہی رہتے ہیں۔ کچھ کے خیال بں ہم خواتین پر بہت لکھتے ہیں' حالانکہ ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم خواتین پر نہیں لکھتے' پیشہ کاغذ پر لکھتے ہیں۔ ایک بار ٹائمز کے ہنری لوئیس کو خط ملا: "مسٹر لوئیس! میری بیوی مجھ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر جا رہی تھی۔ پھر آپ کے میگزین میں طلاق کا مضمرات پر لکھی ٹوری پڑھی اور اس نے ارادہ بدل دیا۔ سو اس ہفتے سے آپ مجھے اپنا پرچہ بھیجنا بند کر دیں۔" ں ہفتے میں ہمیں ایک بیوروکریٹ کا اشتہاری خط ملا۔ ہم تو خطرہ کو بھی خط رہ سمجھتے ہیں مگر ورو کریٹ اور الجبرا ہمیں کبھی سمجھ نہیں آسکا۔ ہم سے بہتر تو روسی چرواہا تھا جسے ایک کوہ بائی کا شوقین بیوروکریٹ ملا۔ بیوروکریٹ نے ایک نظر چرواہے کا بھیڑ کا غلہ دیکھا اور واہے سے کہا کہ اگر میں بتا دوں کہ یہ کل کتنی ہیں تو ایک مجھے دے دو گے۔ چرواہا مان گیا۔ رو کریٹ نے اندازہ لگا کر کہا: "287" چرواہا بہت حیران ہوا۔ بیوروکریٹ نے ایک بکری ں اور اسے کاندھے پر ڈال کر جانے لگا تو چرواہے کہ ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے کہا: ر میں بتا دوں کہ تم کس پروفیشن سے ہو تو تم میری بھیڑ واپس کر دو گے؟" بیوروکریٹ ران ہوا لیکن اس نے سوچا' یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ میرا پروفیشن بتا دے۔ سو اس نے شرط تو چرواہے نے کہا: "تم ایک بیوروکریٹ ہو۔" حیرانی سے بیوروکریٹ نے پوچھا: "آپ کیسے پتہ چلا؟" تو چرواہا بولا: "پہلے کاندھے سے کتا اتاریں' پھر بتاتا ہوں۔" بہر حال سارے وکریٹ برے نہیں ہوتے کچھ بہت برے بھی ہوتے ہیں۔ خط لکھنے والے بیوروکریٹ درد دل رکھنے والوں کے لیے ایک اشتہار لکھ بھیجا ہے۔ اگر چہ درد دل رکھنا اس زمانے

میں میڈیکل پرابلم ہے' کوئی خوبی نہیں۔ بہر حال اشتہار یہ ہے: "مسماۃ قومی یکجہتی عرصہ سے لاپتہ ہے۔ اس کی عمر 49 سال ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے لسانی' مذہبی اور گروہی فسادات میں ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اگر کسی کو ملے تو وہ اسے کابینہ کے اجلاس میں پہنچادے۔" مسماۃ ہونا اتنا پیچیدہ عمل ہے کہ کوئی عورت ہی اس سے عہدہ بر آ ہو سکی ہے۔ باقی ہوش و حواس کھونے والی مسماۃ کو کابینہ کے اجلاس میں پہنچانے کی وجہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی' کیونکہ پہلے ایسے مریضوں کو مینٹل ہسپتال میں پہنچایا جاتا تھا' لیکن اس کیس میں ہم رائے نہیں دے سکتے کیونکہ ہم کبھی کابینہ کے اجلاس میں نہیں گئے۔ البتہ اخباری رپورٹیں پڑھ کر لگتا ہے کہ پہلے بھی مسماۃ جیسی حالت والے لوگ وہاں ریفر کیے جاتے ہیں۔

عورتیں پیدا نہیں ہوتیں' انہیں عورتیں بنایا جاتا ہے۔ مسماۃ قومی یکجہتی کو مسمات شاید اس لیے کہتے ہیں کہ سیاست دانوں نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا' جو مسمات کے ساتھ کرتے ہیں۔ ہم نے کتابوں کی ایک دکان سے پوچھا: "مسماۃ قومی یکجہتی کا علم ہے؟" سیلز مین بولا: "جناب اس طرف چلے جائیں' فکشن کی کتابیں اس طرف ہیں۔" ایک فلم ساز سے پوچھا تو وہ بولا: "اس پر میں فلم بنا رہا ہوں۔ اتنی گرم فلم ہے کہ سردیوں میں شوٹنگ شروع کروں گا۔ اتنی فائٹیں ہیں کہ آپ اسمبلی کو بھول جائیں گے۔" وہ کتاب جس میں سب سے زیادہ بڑے آدمیوں کا ذکر ہے' وہ ہے ٹیلی فون ڈائریکٹری۔ اس میں بھی ہمیں مسماۃ کا کوئی ذکر نہیں ملا۔ آخری بار اسے قائداعظم محمد علی جناح صاحب کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ مسماۃ عرصہ سے خوف زدہ رہتی تھی۔ اتنا بندہ خوف زدہ کبھی نہیں ہوتا' جتنا تب ہوتا ہے جب اسے یقین ہو کہ وہ حق پر ہے۔ ویسے اگر یہ کیس پولیس کو دے دیا جاتا تو اب تک کئی قومی یک جہتیاں برآمد ہو چکی ہوتیں۔ جہاں تک فسادات کے اس پر اثر انداز ہونے کی بات ہے تو یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک دکاندار سے گاہک نے کہا: "آپ سے جو جوتا لیا' وہ چند دنوں میں ہی ٹوٹ گیا۔" تو دکاندار بولا: "آپ نے پہن لیا ہوگا۔" سو صاحب اگر فسادات ہی نہ ہوں تو پھر اتنی لسانی' مذہبی اور گروہی تنظیموں کا کیا استعمال رہ جائے گا۔ دنیا میں جو کچھ جہاں کہیں بھی ہو رہا ہے' کرسی اور کرنسی کے لیے ہو رہا ہے۔ جو کچھ نہیں ہو رہا ہے' وہ بھی اس وجہ سے نہیں ہو رہا۔ جو شخص وقت کی قدر نہیں کرتا' وہ شخص اپنی قدر نہیں کرتا۔ بیوروکریٹ تو اکثر سست ہوتے

ہیں۔ سستی تھکاوٹ سے پہلے آرام کو کہتے ہیں۔ بہر حال اس بیوروکریٹ نے اگر مسماۃ کی تلاش کا بیڑہ اٹھایا ہے تو ہم پرامید ہیں۔ اگرچہ وہ کتاب جس میں ہمیں ہمیشہ امید ملی' وہ ڈکشنری ہی ہے۔ پھر بھی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہوتے ہوئے حکومت کسی وقت بھی امید سے ہو سکتی ہے۔ ایک جاپانی کہانی ہے۔ آدھی رات کو ایک جاپانی لڑکا صحن میں ایک لمبا بانس تھامے کھڑا تھا۔ باپ نے اسے دیکھا تو پوچھا: "تم کیا کر رہے ہو؟" بولا: "آسمان سے چند ستارے توڑنا چاہتا ہوں۔" "ناممکن۔" باپ نے کہا: "البتہ چھت پر چڑھ کر کوشش کرو تو شاید ممکن ہو جائے۔" لیکن یہاں یہ مسئلہ ہے کہ ہمیں پتہ نہیں' مسماۃ قومی یکجہتی کون سی قوم سے ہے۔ ابن انشاء نے شاید اسی کے بارے میں لکھا تھا۔

"ایران میں کون رہتا ہے؟"

"ایران میں ایرانی قوم رہتی ہے۔"

"فرانس میں کون رہتا ہے؟"

"فرانس میں فرانسیسی قوم رہتی ہے۔"

"یہ کون سا ملک ہے؟"

"یہ پاکستان ہے۔"

"اس میں پاکستانی قوم رہتی ہوگی؟"

"نہیں۔ اس میں پاکستانی قوم نہیں رہتی۔"

"اس میں سندھی قوم رہتی ہے۔"

"اس میں پنجابی قوم رہتی ہے۔"

"اس میں یہ قوم رہتی ہے۔"

"اس میں وہ قوم رہتی ہے۔"

فرزندِ جیل

ہمارا مقولہ ہے کہ اگر بندے کو موقع ملے تو زندگی میں ایک بار باہر اور ایک بار اندر ضرور جانا چاہیے۔ یہ الگ بات ہے کہ کچھ بیرون ملک اور جیل جانے والوں کو ہمارا یہ مقولہ معقول نہیں لگا۔ بچپن میں سمجھتے تھے' سورج کا اس کے علاوہ کوئی فائدہ نہیں کہ اس کی وجہ سے گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ ایسے ہی جیل کا یہی فائدہ ہے کہ وہاں چوریاں' ڈاکے اور الیکشن نہیں ہوتے۔ سابقہ حکومت کے ایک وزیر کو فلاحی کاموں کے لیے رقم

ملی۔ اسے فیصلہ کرنا تھا کہ وہ یہ رقم بیواؤں کے سلائی سکول کو دے یا یتیموں کے ادارے کو۔ سو اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد ساری رقم جیل کی حالت سدھارنے پر لگا دی۔ کسی نے وجہ پوچھی تو بولا: "مجھے کبھی بیواؤں کے سکول داخلے کی ضرورت تو پڑے گی نہیں' پھر یتیم خانے میں بھی مستقبل میں رہنے کا امکان نہیں۔ حکومت بدلے گی تو جیل آنا جانا رہے گا' سو کیوں نہ جیل کی حالت سدھار لی جائے۔" ہم نے جیل سے نکلتے کسی کو بہتر بنتے تو نہیں دیکھا' لیڈر بنتے دیکھا ہے۔ کہتے ہیں "جیلیں لوگوں کو بندہ بنانے کے لیے ہیں۔" اس حساب سے تو چند سالوں میں سنتری اور سیاست دان بھی بندے بن جائیں گے' ویسے ابھی تک سنتری اور سنترے میں قدر مشترک "چھلڑ" ہی ہے' ہمیں کسی کو بندہ بنانا تو نہیں آتا' البتہ بندر بنانے کا طریقہ معلوم ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس کی تعریف کریں۔ ہم شیخ رشید صاحب کی تعریف تو نہیں کریں گے کیونکہ وہ ہمیں پسند ہیں۔ اتنا ضرور کہیں گے کہ فرزند جیل شیخ رشید جو پہلے جیل بدلنے میں مشہور تھے' اب جیل نے انہیں بدل دیا ہے۔

اس بار جیل سے رہا ہوتے وقت وہ اپنا سامان اور غصہ وہیں چھوڑ آئے ہیں۔ لوگوں کو اس پر غصہ آ رہا ہے کہ انہیں غصہ کیوں نہیں آ رہا۔ شیخ صاحب جب مارشل لاء کی قید سے نکلے تھے تو ان کا وزن چار کلو بڑھا تھا۔ جمہوریت کی قید نے ان کا اتنا ہی وزن کم کیا ہے۔ ہم ایک وقت میں صرف ایک چیز سے ڈرتے ہیں تاکہ پتہ تو چل سکے کہ ہم کس سے ڈر رہے ہیں۔ شیخ رشید صاحب خدا اور شادی کے علاوہ کسی سے نہ ڈرتے تھے۔ لیکن جیل سے رہا ہو کر شادی کا ارادہ ظاہر کرنے لگے ہیں۔ شادی اور شاعری کے متعلق سوچنے کے لیے جیل سے بہتر کوئی جگہ نہیں' لیکن ایک فلسفی کے بقول اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ ایک آدمی کو شادی کرنا چاہیے یا نہیں' پوری عمر درکار ہے۔ ایک سیاح نے ہالی وڈ میں شادی کی تقریب دیکھ کر گائیڈ سے پوچھا: "یہ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" "طلاق کی شروعات۔" گائیڈ نے جواب دیا۔ ہمیں تو لگتا ہے شیخ رشید صاحب نے رہا ہو کر جیل جانے کی شروعات کی ہیں۔ ویسے بھی شیخ صاحب جیل سے نکلتے ہیں تو قیدی جتنے پریشان اور دکھی ہو جاتے ہیں' اتنے تو لال حویلی والے شیخ صاحب کے گرفتار ہونے پر نہ ہوتے ہوں گے۔

سیاست دان جیلوں میں آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں چور ڈاکو بھی بند ہوتے ہیں۔ اس

لیے انہیں تنہائی کا احساس نہیں ہوتا۔ اگرچہ جیل میں کبھی کبھی دنگا فساد اور گالی گلوچ ہوتا رہتا ہے' پھر بھی سیاستدانوں کو اسمبلی کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ اسمبلی وہ جگہ ہے جہاں ہر بندہ دوسرے کو سیاست دان اور خود کو دیانت دار سمجھتا ہے۔ اگرچہ ہیرا ہیرے کو' لوہا لوہے کو اور انسان کو انسان کاٹتا ہے' لیکن ہم نے کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی سیاست دان یا جاگیر دار کے گھر ڈاکہ پڑا ہے۔ اسے کہتے ہیں پروفیشنل کرٹسی۔ ایک مزاح نگار نے کہا تھا' مجھے گانے سے عشق ہے۔ اس لیے میں ٹی وی پر موسیقی کے پروگرام نہیں دیکھتا۔ ہمیں وطن سے شدید محبت ہے۔ اس لیے کبھی اسمبلی کی کارروائی دیکھنے نہیں گئے' البتہ کارروائی اخبار میں پڑھ کر ہمارا استحقاق کئی بار مجروح ہوا ہے۔ پاکستان میں 99 فیصد لوگ محب وطن ہیں۔ باقی ایک فیصد اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔ لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال تو مغربی ممالک میں بھی ایسی ہے کہ لٹیرے وہاں اس کام کے لیے اکیلے نہیں نکلتے' پارٹی بنا کر نکلتے ہیں۔ لاء اور ان لاء سے کون نہیں ڈرتا۔ روس کی ایک عدالت نے ایک شخص سے کہا: "یور آنر! میں مانتا ہوں' تیز رفتار گاڑی چلا رہا تھا۔ کچھ خیال کریں۔ میں ممبر پارلیمینٹ ہوں۔" تو عدالت نے تیس دن کی سزا دیتے ہوئے کہا: "اگنورینس از نو ایکسکیوز۔" شیخ صاحب سے کسی نے پوچھا: "اس بار کس جرم کی وجہ سے جیل گئے؟" کہا: "پکڑے جانے کی وجہ سے۔" جیل وہ جگہ ہے جہاں قیدی دعا مانگتا ہے کہ اسے سانپ نظر آئے تاکہ اسے مار کر آٹھ دن کی معافی لے لے۔ جس عمر کے بچوں کو گھر والے سکول سے لینے جاتے ہیں' شیخ رشید کے گھر والے اس عمر میں انہیں جیل سے لینے جایا کرتے۔ ان کی والدہ کہتیں: "رشید اگر تم میرے بیٹے کی بجائے بیٹی ہوتے' تو مجھے یہ پریشانیاں نہ ہوتیں۔" اس معاملے میں محترمہ بے نظیر صاحبہ بھی ان کی ماں کی طرح سوچتی ہیں۔ ایک مزاح نگار کہتا ہے: "میری وجہ سے کئی لڑائیاں ہوئیں۔ میرے ماں باپ مجھے دیکھتے ہی لڑنے لگتے۔" لیکن شیخ رشید صاحب جس دن کسی سے لڑ کر نہ آتے' تو والدہ گھبرا جاتیں کہ کہیں رشید بیمار تو نہیں۔ وہ کھلے ذہن کے بندے ہیں۔ ہر مسئلے پر کھلے "ذہن" سے سوچتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں کسی نے کہا: "اگر تم پر زمین تنگ کر دی جائے تو کیا کرو گے؟" تو وہ بولے: "نیوی جائن کر لیں گے۔" ان کے خیال میں ہارس پاور گھوڑوں کے پاس ہی رہتی' تو بہتر تھا۔

پہلے جو لڑائی سے ڈرتا تھا' اسے بزدل کہتے تھے آج کل کنوارہ کہتے ہیں۔ سیاسی کنوارے شیخ رشید آج کل بڑے محتاط ہو گئے ہیں۔ احتیاط اور بزدلی میں یہ فرق ہے کہ اگر آپ خود ڈر کر کسی کام سے ہاتھ اٹھا لیں تو احتیاط ہو گی اور اگر کوئی دوسرا اس طرح کرے تو یہ بزدلی ہو گی۔ ویسے بھی جو کسی ایک بندے سے دوسری بار دھوکا کھاتا ہے' وہ اس دھوکے از کا ساتھ دیتا ہے۔ بندے کو اپنے دشمنوں سے اچھا سلوک کرنا چاہیے کیونکہ آپ نے نہیں خود بنایا ہوتا ہے۔ شیخ رشید کمزوروں کی طاقت استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ ویسے کمزور وہ ہے جو کم زور لگائے۔ جیل سے رہائی کے بعد سے ان کے پاؤں زمین پر نہیں لگتے' جس کی یک وجہ تو یہ ہے کہ وہ بمشکل رہا ہوئے ہیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے پاؤں میں جوتے وتے ہیں۔ چین کے رہنمائے اعلیٰ ڈینگ سیاؤنگ کی سالگرہ پر وزارت خارجہ کے ترجمان ہین جیان نے کہا: "ان میں اس سال کم از کم ایک یقینی تبدیلی آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ یک سال بڑے ہو گئے ہیں۔" ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ وہ ڈیڑھ سال بڑے ہو گئے ہیں۔ للہ ان کی زبان اور عمر دراز کرے۔

حقہ شاہی

جب سے نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نئی کار پر چڑھے ہیں' لوگ یوں چیخ رہے ہیں جیسے کار ان پر چڑھی ہو۔ نواب زادہ نصر اللہ خان کی نئی کاریں پیر پگاڑہ کی باتوں کی طرح ہمارے تو سر سے گزر گئیں' لیکن لوگ نواب زادہ صاحب سے دو وجوہ کی بنا پر ناراض ہیں۔

الف۔ کار ہونا۔

ب۔ کار ہونا۔

حکومت نے انہیں دو نئی کاریں کیا لے دیں' اسمبلی کی "کار" وائی "دو کار" وائی بن گئی۔ اب اتفاق سے کاروں کا رنگ سیاہ ہے۔ یوں جب بھی کوئی کسی "سیاہ کار" کا ذکر کرتا ہے' اب صاحب سمجھتے ہیں ان کی بات ہو رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست کہتے ہیں' 1994ء تک برا ابھی حادثہ نہ ہوا' لیکن پھر میں نے کار خرید لی۔ لیکن نواب صاحب کو جتنے بھی حادثے ش آئے' وہ سڑک پر نہیں' اسمبلی میں پیش آئے۔ "بے کار" تو نواب صاحب کبھی بھی ہیں رہے' لیکن پہلے نواب صاحب کی کار کی عمر نواب صاحب جتنی ہی تھی۔ سو وہ کار میں بار ہے ہوتے تو لوگ تیزی سے پرے پرے ہٹ کر راستہ دیتے۔ کچھ پتہ نہ چلتا یہ نواب ساحب کی وجہ سے ہو رہا ہے یا کار سے خوف زدہ ہو کر۔ ان کی کار کی رفتار سے تو ظفر اقبال ساحب کے شعر کہنے کی رفتار زیادہ تھی۔

بہت کم عورتیں اپنی شکل اور مرد اپنی حرکتوں سے اپنی اصل عمر کے لگتے ہیں۔ نواب ساحب بھی اپنی سیاست سے اپنی اصل عمر کے نہیں لگتے۔ پکا پتہ نہیں' وہ کب پیدا ہوئے۔ یہ پکا پتہ ہے کہ وہ پیدا ہوئے۔ ان کی ایک ہم عمر اداکارہ ایٹک شو پر گئی تو کئی خواتین نے اسے بھی خریدنے کی کوشش کی۔ ویسے بھی ان کی صرف یہ خوبی انہیں ہم سے افضل نہیں بنا سکتی کہ وہ ہم سے پہلے پیدا ہوئے۔ البتہ انہیں ہم سے بوڑھا بنا سکتی ہے۔ نواب صاحب ترکی ٹوپی میں جب ترکی بہ ترکی حقہ زنی کرتے ہیں' تو ہم ہی کیا انہیں دیکھ کر تو بچے بھی خوش ہو جاتے ہیں۔ ہمارا تو کئی بار انہیں فریم کرانے کو دل چاہا۔ ان کے حقہ بگوش بتاتے ہیں' کشمیر سے ان کی محبت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کشمیر بھی "کش" سے شروع ہوتا ہے۔ کچھ کے خیال میں جو بندہ حقے کو منہ لگا لے' اسے منہ نہیں لگانا چاہیے۔ لیکن اودھ کے دربار میں تو حقہ پینا فرائض منصبی میں شامل تھا۔ یہاں تک کہ جو حقہ نہیں پیتے تھے' ان کے لیے بغیر تمباکو اور آگ کے حقہ لایا جاتا اور وہ اس کی نے محض منہ میں رکھ کر اپنے فرائض انجام دیتے۔ مغلیہ دور میں تو حقہ اور تمباکو نوشی کے لیے انتظام کی غرض سے ایک علیحدہ محکمہ قائم ہوا جو بھنڈار خانہ کہلاتا۔ ہم نے تو نواب صاحب کی قدر نہ کی' مغلیہ دور میں ہوتے تو وہ "وزیر بھنڈار" ہوتے۔ قائد آرام نواب زادہ نصر اللہ خان صاحب نرسیماراؤ کے ہم عمر ہیں۔ نرسیماراؤ بھی کچھ نہ کرنے کے فن میں ماہر ہیں۔ کچھ کرتے ہوئے مصروف نظر آنا تو کوئی بڑی بات نہیں' لیکن کچھ نہ کرتے ہوئے

مصروف نظر آنے کے لیے اک عمر چاہیے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے کہا ہے کہ مجھے سیاست سے نفرت تھی' مجبوراً سیاست میں آئی۔ سیاست میں اپنی کارکردگی سے انہوں نے یہ ثابت بھی کیا۔ ہماری سیاست کی ٹریجڈی بھی یہی ہے کہ اسے کامیڈی سمجھا گیا۔ سیاست میں وہ لوگ ہیں جنہیں سیاست اچھی نہیں لگتی اور باہر وہ لوگ جنہیں یہ اچھے نہیں لگتے۔ پیپلز پارٹی کی حکمرانی دراصل حکم۔رانی ہے' جس نے نواب زادہ صاحب کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنادیا تاکہ وہ حقے میں چناروں کی آگ دھر سکیں۔ لوگ کہتے ہیں' ریچھ کی دوستی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ جب وہ خوش ہوتا ہے تو گلے لگالیتا ہے۔ بہر حال نواب صاحب نے کشمیر کمیٹی کی چیئرمینی کے لیے جس کنڈیشن پر کام کیا ہے' وہ ایئر کنڈیشن کہلائی۔ اس کمیٹی نے معاملات کو جس رفتار سے آگے بڑھایا' وہی تھی جس رفتار سے نواب صاحب حقہ پیتے ہیں۔ سو ممکن ہے' حکومت نے خود انہیں کاریں دی ہوں تاکہ وہ تیز روی کا مظاہرہ کر سکیں۔

سنا تھا' اپنے بچوں کو گاڑی نہ چلانے دیں جب تک کہ وہ بڑے نہیں ہو جاتے' ورنہ وہ کبھی بڑے نہیں ہوں گے۔ یہ نہ سنا تھا کہ بڑوں کو گاڑی لے کر نہ دیں وہ چھوٹے ہونے لگیں گے۔ لندن کی ٹریفک ایسی ہے کہ وہاں ٹریفک کے قوانین کی پابندی نہ کرو' تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ مگر ہماری ٹریفک ایسی ہے کہ ٹریفک رولز کی پابندی کرو تو حادثہ ہو جاتا ہے۔ اگرچہ نواب صاحب عرصے سے اس بیماری میں مبتلا ہیں کہ جب ان کی آنکھیں بند ہوں تو انہیں کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ البتہ انہیں ٹریفک کے رولز بھاتے ہیں' بالخصوص رولز رائس' گھوڑے اور نواب زادہ صاحب کا بڑا پرانا "رشتہ" ہے۔ گھوڑوں کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔ صرف اس جگہ نہیں پائے جاتے' جہاں انہیں پایا جانا چاہیے۔ نواب صاحب کو بھی حادثے اس لیے پیش آرہے ہیں کہ یہ وہاں نہیں پائے جاتے' جہاں انہیں ہونا چاہیے۔ ان کا یہ ہونا ہی ہونی ہے۔ ہم بحث نہیں کرتے' کیونکہ کہتے ہیں کسی کو احمق سمجھ کر اس سے بحث کرنے سے پہلے یقین کرلیں کہ وہ بھی تو یہی کچھ نہیں کر رہا۔ ہم ڈاکٹر ہیں' اس لیے نواب صاحب کو کوئی مشورہ نہیں دینا چاہتے' ورنہ لوگ انہیں بیمار سمجھنے لگیں گے۔ برطانیہ کے ایک پاکستانی ڈرائیور نے اپنی ٹیکسی کے بائیں دروازے پر لکھا تھا: Exist اور دائیں دروازے پر No-Exist۔ کسی نے کہا' بھئی صحیح لفظ Exit ہے تو اس پر پاکستانی ڈرائیور بولا: "لندن میں

اگر آپ ایگزٹ بائیں طرف سے کریں تو ایگزسٹ کریں گے۔ اگر دائیں طرف سے باہر نکلیں گے تو آپ ایگزسٹ نہیں کریں گے۔" تو نواب صاحب نے بھی اگر دائیں بازو سے ایگزٹ کرنے کی کوشش کی تو ایسا ہی ہوگا۔ پھر کاروں کا حادثہ سڑک پر ہو تو بندے کے بچنے کا چانس ہوتا ہے۔ اگر اسمبلی میں ہو جائے تو صرف کاریں ہی بچتی ہیں۔ نواب زادہ صاحب جب کشمیر کمیٹی کے چیئرمین بنے تھے تو ہمیں کسی اچھی خبر کی توقع تھی' لیکن ان کی ہر خبر اس امریکی اخبار کے رپورٹر جیسی ہی نکلی جسے سمندر کے سفر پر بھیجا گیا۔ جس روز اس کا جہاز فرانس کی بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا' وہاں بڑے زور کا طوفان آیا جس سے بڑے پیمانے پر تباہی ہوئی۔ اخبار کا ایڈیٹر خوش تھا کیونکہ صرف اسی کے اخبار کا رپورٹر اس جہاز میں موجود تھا۔ وہ تار کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ بالآخر رات گئے تار موصول ہوا' جس پر لکھا تھا: "میں بخیریت ہوں۔ آپ فکر نہ کریں۔"

کتا فہیم

غلام مصطفیٰ کھر صاحب کو ہم تب سے جانتے ہیں' جب وہ شیر ہوتے تھے۔ اب تو کھر کی سیاست 'گھر کی سیاست ہو کر رہ گئی ہے۔ بھلے وقتوں میں جب وہ سمجھتے ان کے ووٹ کم ہو رہے ہیں' وہ شادی کر لیتے کیونکہ شادی میں ایک اور ایک دو نہیں ہوتا گیارہ ہوتا ہے۔ بہر حال پھر سے گھر اور اخبار میں سرخیاں لگنے لگتیں۔ شادی کے معاملے میں وہ پاکستانی الزبتھ ٹیلر ہیں۔ الزبتھ ٹیلر تو اکثر بیمار رہتی ہیں۔ ایک صحافی نے الزبتھ سے پوچھا: "آپ نے آٹھ

شادیاں کیوں کیں؟" بولی: "کیونکہ میں زیادہ عرصہ تو بیمار رہی۔" فورٹینسکی کی جب الزبتھ سے علیحدگی ہوئی تو کسی نے لاری فورٹینسکی سے پوچھا: "اب آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟" بولا: "بیروزگار ہو گیا ہوں۔" مشہور عالم ایکٹریس گریٹا گاربو نے کہا تھا: "میں کئی ڈراموں میں کئی آدمیوں کی بیوی بنی ہوں۔ میری ازدواجی زندگی کا راز یہ ہے کہ میں اپنے اصلی خاوند کو بھی انہی میں سے ایک سمجھتی ہوں۔" کھر صاحب نے الزبتھ ٹیلر کی طرح جب بھی شادی کی۔ لوگوں نے کہا "ہمیں اس شادی کی کامیابی کی بڑی امید ہے۔ کیونکہ یہ تجربہ کار دولہا دولہن کے درمیان ہو رہی ہے۔" کہتے ہیں کوریا میں 34.2 فیصد مرد کتے پالتے ہیں' جب کہ باقی شادی کر لیتے ہیں۔ اخبارات میں مصطفیٰ کھر کے کتوں کے سکینڈل یوں چھپ رہے ہیں جیسے کبھی موصوف کے اپنے چھپا کرتے تھے۔ کتوں کی ایسی خبریں چھپ رہی ہیں جو کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ وزیر توانائی مصطفیٰ کھر کے محکمے کی توانائی ان کتوں کی صحت سے عیاں اور عریاں ہے۔ یہ درجنوں کتے اعلیٰ نسل کے ہیں جب کہ یہ دعویٰ ہمارے متعدد سیاست دانوں کے بارے میں نہیں کیا جا سکتا۔ آج مختلف سیاست دان مختلف حوالوں سے مشہور ہیں۔ فاروق لغاری صاحب آرڈیننس اور قلب جاری کرتے ہیں۔ جانوروں کا وہ اتنا شکار کرتے ہیں کہ اب تو انہیں جانور بھی پہچاننے لگے ہیں' مگر بکری کا گوشت نہیں کھاتے اس سے آدمی اتنا بودا ہو جاتا ہے کہ حکومت کی ہر بات اچھی لگنے لگتی ہے۔ نواز شریف کو بھی جانوروں سے بڑی محبت ہے' بشرطیکہ وہ بھنے ہوئے ہوں۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اپنی اور حقے کی کیپ کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آج کل حکومت نے انہیں کشمیر کمیٹی میں کیپ کیا ہوا ہے۔ البتہ پنجاب کے شیر نے اب کتے پال لیے ہیں اور آج کل اسی حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہم کتوں کو گھر میں رکھنے کے خلاف ہیں کہ اس سے کتوں کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے' اور وہ مزید کتے ہو جاتے ہیں۔ سیاست دانوں کے ساتھ کتوں کا گھلنا ملنا تو ہمیں بالکل پسند نہیں۔

کتے دو قسم کے ہوتے ہیں۔ کچھ چار ٹانگوں والے بھی ہوتے ہیں۔ "نیو انگلش ڈکشنری" میں سترھویں صدی کے بعد کتے کا مفہوم یہ ہے "خوش باش آدمی' مزے کا آدمی' یار دوست۔" مغرب میں تو کتے کو وہی مقام حاصل ہو جاتا ہے' جس پر آ کر وہ بیٹھتا ہے۔ الزبتھ ٹیلر کی تازہ طلاق اس لیے ہوئی کہ لاری فورٹینسکی کو الزبتھ ٹیلر سے یہ شکایت تھی کہ وہ

کتے کو اس سے زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ ہمیں لگتا ہے' صحافیوں کو بھی کھر صاحب سے یہ شکایت ہے کہ وہ سیاست کو کتوں جتنی اہمیت کیوں نہیں دیتے۔ ایک زمانہ تھا' وہ عوام کیلئے سب کچھ قربان کرنے کیلئے تیار ہوتے تھے۔ 1990ء میں جب انہیں پتہ چلا کہ پاکستان میں 48 لاکھ لڑکیاں شادی کے انتظار میں بیٹھی ہیں تو انہیں اس وقت تک رات کو نیند نہ آئی جب تک انہوں نے اس تعداد میں ایک کمی نہ کر دی۔ لیکن اب لگتا ہے' وہ پاکستان کو کوریا بنانا چاہتے ہیں۔ کوریا میں انسانوں کے مشابہ بنانے کے لیے کتوں کی پلاسٹک سرجری ہوتی ہے تاکہ کتے کی شکل دیکھ کر بتایا جاسکے کہ اس کا مالک کون ہے۔ جنوبی کوریا میں کوئی کتے کو گالی دیتا ہوا پکڑا جائے تو اسے 20000 ون (کورین کرنسی 750 ون ایک ڈالر کے برابر) جرمانہ ہوتا ہے۔ وہاں تو کتوں کا جنازہ لے جانے کا رواج ہے۔ البتہ چین میں تو لوگ کتوں کو کھانے کو پڑتے ہیں' البتہ ہمارے ہاں کے کتے نرے کتے ہوتے ہیں۔

نواب آف کالاباغ نے کہا تھا' جس عہدے کے آخر میں نر آئے' اس سے ڈرو۔ جیسے گورنر' کمشنر' ڈپٹی کمشنر' سو جب کھر صاحب گورنر تھے تو لوگ ڈر کر انہیں شیر بھی نہ کہتے بلکہ چڑیا گھر کے شیر کو بھی ڈر کے مارے کھر صاحب کہہ کر بلاتے۔ وہ بھی خود کو شیر ہی سمجھتے۔ اسی لیے جب وہ اپنی حکمرانی میں ایک بار چڑیا گھر گئے تو سب سے پہلے شیرنی کے پنجرے کی طرف گئے۔ وہ شیر تو تھے مگر آدم خور شیر نہ تھے' حواخور شیر تھے۔ پیر پگاڑو سے کسی نے اس شیر کے بارے میں پوچھا تو وہ بولے: ''ہم اشرف المخلوقات سے رابطہ رکھتے ہیں' جانوروں سے نہیں۔'' یہ الگ بات ہے پیر صاحب کی مطلقہ بیوی نے ان کے ایام پیری کی حواخوریوں کا جو ذکر کیا ہے' اس سے ہمیں وہ بھی شیر لگنے لگے ہیں۔ لیکن جب شیر کتوں کے حوالے سے پہچانے جائیں تو کتے شیر ہو جاتے ہیں۔

ورلڈ کپ

صاحب ہمارے ہاں کوڑا کرکٹ اور کرکٹ کس گلی میں نہیں ہوتا۔ کرکٹ میں لوگوں کی دلچسپی کا یہ عالم ہے کہ ہسپتال میں ہم نے ایک مریضہ سے پوچھا: ''آپ کا چھوٹا بیٹا کب پیدا ہوا؟'' تو وہ بولی: ''جب جاوید میانداد نے شارجہ میں چھکا لگایا۔'' اور تو اور ہم نے اپنے دوست کی بیوی کو فون کر کے پوچھا: ''آپ کا سر درد کیسا ہے؟'' بولی: ''وہ تو اس وقت باہر کرکٹ کھیل رہا ہے۔'' بندہ کسی سے خیریت پوچھے تو وہ سکور بتاتا ہے۔ البتہ جب سے بھارتی اداکارہ آئشہ

جھلکا نے اعلان کیا ہے کہ جو بھارتی کھلاڑی ورلڈ کپ میں سب سے زیادہ سکور کرے گا' میں اس سے شادی کروں گی۔ تب سے بھارتی کھلاڑیوں کی بیویاں ڈرتے ڈرتے سکور گنتی ہیں کہ کہیں ان کا خاوند زیادہ سکور نہ کر دے۔ بھارتی کھلاڑی بھی دب کر کھیل رہے ہیں۔ ایسے ہی ایک بار اداکارہ شمیم آراء نے اعلان کیا تھا کہ میں اس سے شادی کروں گی جو کشمیر فتح کرے گا۔ کشمیر کے اب تک فتح نہ ہونے کی وجہ تو آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔ بہر حال اسی بہانے جھلکا نے ورلڈ کپ میں جھلکی دکھا دی۔

اداکارائیں سمجھتی ہیں' شادی ایک کھیل ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کرکٹ ایک کھیل ہے۔ کوئی نیا کھلاڑی ہی لوز بال اور ایسی ہی ٹاک پر آؤٹ ہو سکتا ہے جیسے کرکٹرز کو سگریٹ چھوڑنے کیلئے WILL اور نہ چھوڑنے کے لیے WILLS چاہیے' ایسے ہی اداکاراؤں کو اکثر طلاق لینے کے لیے شادی کرنا پڑتی ہے۔ اداکاراؤں اور کرکٹرز کی شادیاں ہوتی رہتی ہیں' بلکہ ہوتی ہی ہیں' رہتی کہاں ہیں۔ اداکارائیں پبلسٹی حاصل کرنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں' یہاں تک کہ شریف بھی بن سکتی ہیں۔ لیکن ان کی فلمیں دیکھ لو تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ شادی اور عمر کے علاوہ کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ ہالی وڈ میں ویک اینڈ بہتر بنانے کے لیے شادی ہوتی ہے اور لالی وڈ میں فلم کا اینڈ بہتر بنانے کے لیے۔ اداکارہ زازا گیبو نے آٹھ نو شادیاں کیں۔ کسی نے پوچھا: "شادی محبت کے لیے کرتی ہو' ذہنی سکون حاصل کرنے کے لیے یا سہارا حاصل کرنے کے لیے؟" بولی: "طلاق حاصل کرنے کے لیے۔" مغرب میں طلاق لینے پر بیوی کو اتنی رقم ملتی ہے کہ اب تو وہاں عورتیں اس بندے سے شادی کرتے ڈرتی ہیں جس سے طلاق لینے میں مشکل ہو سکتی ہو۔ البتہ الزبتھ ٹیلر نے اب یہ کہہ دیا ہے کہ اس کا آٹھ شادیاں کرنا غلط تھا۔ شادی ایک ہی ہونا چاہیے۔ سو اب اس نے ایک شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

آئشہ جھلکا کے ایک ہمسائے نے بتایا کہ وہ شروع ہی سے اتنی شرمیلی تھی کہ کم از کم پانچ بار سیٹی بجانے پر ایک بار رکتی۔ ہمیں تو ورلڈ کپ 1996ء کے موقع پر آئشہ جھلکا کے بیان سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ بڑی شرمیلی ہیں۔ اگر شرمیلی نہ ہوتی تو وہ یہ بیان 1992ء کے ورلڈ کپ کے موقع پر ہی دے دیتی۔ البتہ اتنا پتہ چلا ہے کہ اسے باکسنگ پسند ہے۔ شاید اسی

لیے شادی کرنا چاہتی ہے۔ باکسنگ کا کھیل شادی کی طرح ہے۔ کبھی پہلے ہی راؤنڈ میں فیصلہ ہو جاتا ہے اور کبھی آخری لمحے تک لڑائی چلتی ہے۔ ایک بار مائک ٹائی سن کے حریف نے کہا: "ڈریسنگ روم رنگ سے اتنے فاصلے پر کیوں رکھا گیا ہے؟" تو مائک ٹائی سن نے کہا: "آپ کو کیا' آپ نے کون سا خود چل کر جانا ہے۔" بہر حال جہاں تک آئشہ جھلکا کی بات ہے' اسے کھیلوں میں کرکٹر پسند ہیں۔ ہمیں تو کھیلوں سے اتنی ہی دلچسپی ہے کہ سکول کے زمانے میں گراؤنڈ میں سنٹر فارورڈ ہوتے اور کلاس میں رائٹ بیک۔

آئشہ جھلکا کا لباس اس کی گفتگو کی طرح نپا تلا ہوتا ہے۔ مختصر لباس کی خامی یہ ہے کہ ہر کسی کی نظر لباس پر مختصر ہی پڑتی ہے۔ جیسے جوش ملیح آبادی کو جب کچھ نہ کہنا ہوتا' تو وہ ستر ستر بند کی نظمیں کہتے۔ جب فی الواقع کچھ کہنا ہوتا تو چار مصرعوں کی رباعی کہتے۔ ایسے ہی جھلکا نے جب کچھ کہنا ہوتا ہے تو چپ رہتی ہے۔ عدنان سمیع خان کی طرح معصوم چہرہ' عدنان سمیع خان کا چہرہ تو ایسا ہے کہ فلم سرگم میں جب اپنے معصوم چہرے سے زیبا بختیار کی طرف بے اختیار دیکھتے تو گیلری میں بیٹھی ہوئی عورتیں اپنے بچے گود میں لے کر سہلانے لگتیں۔ اداکارائیں اپنی شادی پر اکثر سب سے اچھی پرفارمنس دیتی ہیں' کیونکہ اس سین کی انہیں بڑی ریہرسل ہوتی ہے۔ شوکت تھانوی کی بہن کی شادی پر دوست انہیں بار بار مذاق کر رہے تھے کہ یہ دلہن کا بھائی ہے۔ آخر شوکت تھانوی صاحب سے نہ رہا گیا۔ کھڑے ہوئے اور اعلان کیا کہ ہاں میں دلہن کا بھائی ہوں اور ہمارے ہاں یہ رسم ہے کہ جب لڑکی بڑی ہو جائے تو اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ حالانکہ فلم والوں میں ایسی کوئی رسم نہیں' پھر اچھے بیٹسمین ایک "رن" کے لیے نہیں بھاگتے۔ اگر دو کھلاڑیوں نے ایک سا سکور کیا تو پھر آئشہ جھلکا اس بنا پر فیصلہ کریں گی کہ کس کا "رن" ریٹ زیادہ۔ ویسے ہمارے خیال میں اگر آئشہ جھلکا نے یہ پیشکش بھارت کو ورلڈ کپ جتوانے کے لیے کی ہے تو اسے چاہیے تھا' یہ اعلان کرتی کہ جو بھارتی کھلاڑی سب سے کم سکور بنائے گا' میں اس سے شادی کروں گی۔ اسی ڈر سے بھارتی کھلاڑی دل کھول کر سکور بناتے اور ورلڈ کپ جیت جاتے۔